صدّیق عالم
آخری چھاؤں

اور دوسری کہانیاں

صدّیق عالم

ہندوستان میں پہلی بار، ۱۹۸۲ء

© صدّیق عالم، ۱۹۸۲ء

زیرِ اہتمام: زم زم بک ٹرسٹ، وشوکرما نگر، شاہدرہ، دہلی - ۱۱۰۰۳۲

ناشر: صدّیق عالم، ڈاکٹر ڈانگہ، پورولیا - ۷۲۳۱۰۱ - (مغربی بنگال)
INDIA

تقسیم کار: عثمانیہ بک ڈپو،

۱۲۵ ار ابندر سرالنی، کلکتّہ ۷۰۰۰۷۳

۵۵ زم زم بک ٹرسٹ، وِشوکرما نگر،

شاہدرہ، دہلی - ۱۱۰۰۳۲ - (انڈیا)

INDIA

یہ کتاب مغربی بنگال اُردو اکادمی کی مالی اعانت
سے منظرِ عام پر آئی ہے

کتاب کا نام: آخری چھاؤں اور دُوسری کہانیاں

مصنّف: صدّیق عالم

تعداد: ایک ہزار

کاتب: ایس۔ آر

قیمت: پندرہ رُوپے

مطبوعہ: جے کے آفسٹ پرنٹرز - دہلی ۶

مصنّف کا نوٹ

زیرِ نظر کتاب میں شامل کہانیوں میں "نفرت کا حق" اور "میرا شہر کلکتہ" کو چھوڑ کر باقی تمام کہانیاں غیر مطبوعہ ہیں۔ میں عرصے سے اپنے کسی مجموعے کی اشاعت کو ٹالتا رہا۔
کیونکہ تجربات قلم کو ایک
مقام پر ٹھہرنے نہیں دیتے تھے اور اس
صورت میں اس کا نتیجہ خیز ثابت ہونا ممکن نہ تھا۔ ایک طرح سے میں ادب کے . . .
NO MANS LAND. پر کھڑا تھا۔ لیکن پھر
امکانات یکجا ہوتے گئے۔ خاردار تاروں کی باڑ جگہ جگہ سے ٹوٹتی گئی۔ میں اپنے
آفاقی نقطۂ نظر
کے قریب پہنچتا گیا۔ لیکن اُس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے اپنے پیروں کے نیچے زمین کی
موجودگی کا احساس ہو چکا ہے۔ ایک ادیب جب بھی قلم اُٹھاتا ہے وہ ایک نئے تجربے سے
دو چار ہوتا ہے اور یہی امر اس کے قلم کی اہمیت کو
برقرار رکھنے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ موجودہ
مجموعے میں میرے تجربات کا عروج "کیلیڈوسکوپ" ہے۔ یعنی
وہ مقام جہاں یہ تجربہ بجائے خود ایک حیران کُن مرحلہ بن گیا ہے۔ حیران کُن،
اور خود مصنّف کے لئے دلچسپ بھی۔

میں ذاتی طور پر مرشد عالم، ہیڈ مدرس، عائشہ کچھی اُردو ہائی اسکول، اپنے دوست ونئے کمار اور —— زم زم بک ٹرسٹ کا ازحد ممنون ہوں کہ اگر اُن کا پُر خلوص تعاون شامل نہ ہوتا تو اکادمی کی مالی اعانت کے باوجود شاید یہ کتاب منظرِ عام پر نہ آپاتی۔

صدّیق عالم

ماں کے نام

وائلن کی موت

شیام نے ٹائپ رائٹر سے چہرا اٹھا کر دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی اور رات کی خاموشی سے ابھرتی ہوئی مخصوص آوازوں کو کان لگا کر سننے لگا۔ پھر اس نے اپنی کرسی پر نیم دراز بوڑھے نریندر کی طرف دیکھا۔

"طبیعت تو خراب نہیں تمہاری ؟" اس نے پوچھا۔

"میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔" نریندر کی آواز سنائی دی۔

"تم اپنے آپ کو تباہ کر لو گے۔ میں نے سنا ہے آج کل پینے بھی لگے ہو۔ تم بہت بدل گئے ہو نریندر ——"

نریندر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ چپ چاپ اپنی کرسی سے اٹھا، ریکسین کی تھیلی بغل میں دبائی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ شیام اس کے قدموں کی چاپ باہر برآمدے پر مدھم پڑتے سنتا رہا، پھر دوسرے ٹائپسٹ کی طرف مڑ کر بولا۔ "کچھ دنوں بعد دیکھ لینا یہ پاگل ہو جائے گا۔ جمال کہہ رہا تھا کہ کل رات اس نے بہت دیر تک اسے وائلن بجاتے سنا تھا۔ دوسرے پہرے داروں نے اسے روتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ یہ اتنا جذباتی آدمی ہے کہ خود اسے اسکے ہاتھوں نہیں چھوڑا جا سکتا۔"

"میں جب سے یہاں پر ہوں اسے اسی طرح دیکھتا آ رہا ہوں۔"

"بھگوان کے لئے نہیں، اگر تم غور سے اس کی طرف دیکھو تو تمہیں اس کے اندر ایک

بہت بڑی تبدیلی کا احساس ہوگا"، شیام نے ٹائپ کرتے ہوئے کہا۔ ایک پل کے لئے کی بورڈ پر اسکی انگلیاں ساکت ہوگیئں اور اس کی نظریں کھڑکی سے پھسل کر آفس کے لان میں چلی گیئں، جہاں چاندنی میں یوکلپٹس کے درخت لہرا رہے تھے۔

"یہ بوڑھا جانے کون سا اسرار اپنے دل میں ڈھوئے پھر رہا ہے"۔ اس نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "اسے میں نے ہمیشہ ایک کیتھڈرل کی طرح پر سکون پایا ہے، ایک ایسا کیتھڈرل جو آتش فشاں کے دہانے پر رکھا ہوا ہو ــــــ"

(۲)

اس تاریک کونے میں آج بیس سال سے بیٹھ کر وہ ٹائپ کر رہا تھا۔ تہوار کی چند اہم چھٹیوں کو چھوڑ کر، جب گھر میں اس کی موجودگی نہایت لازمی تصور کی جاتی، عام چھٹیوں میں بھی، جب کہ پوری عمارت سنسان پڑی رہتی، وہ ٹائپ رائٹر پر جھکا ہوا اسی ایک آہنگ میں ڈوبا رہتا جسکیلئے کبھی کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ شروع میں کچھ برس وہ اکتایا اکتایا سا چڑچڑا مزاج رہا۔ باہر کی دنیا کی وسعت اور روشنی کو فراموش کرنے میں اسے ایک لمبا عرصہ لگ گیا۔ پھر دھیرے دھیرے وہ اس تاریک کونے کا، ماحول کی اس یکسانیت کا عادی بن گیا اور آخرکار اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ خود بھی اس بے کیف ماحول کا ایک اٹوٹ حصّہ ہو، اسی تاریک کونے سے ابھرا ہو۔

وہ ایک غریب خاندان کا پروردہ اور سرپرست تھا۔ بیس سال سے اس بوجھ کو اٹھائے رہنے کے سبب اسکی ہڈیاں ریزہ ریزہ ہو رہی تھیں۔ مایوسی اور مفلسی نے اس کا لہو اچھی طرح نچوڑ لیا تھا اور جو امر اب بھی اسے مزید جدوجہد کے قابل بنائے ہوئے تھا وہ تھا مکمل تباہی کا خوف۔

جس طرح کسی قدیم عمارت میں، جس کی مرمت کی طاقت اب اس کے مکین کے اندر نہ ہو، یہ جانتے ہوئے بھی کہ کسی بھی لمحے وہ عمارت ٹوٹ کر زمین بوس ہو سکتی ہے، لوگ اسکی چھت کے نیچے گناہ کرتے ہیں، مسکراتے ہیں اور گرہستی کے فرائض انجام دیتے ہیں، وہ بھی فرض کی المناک چاردیواری میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چن دیا گیا تھا۔

بیس سال پہلے، نومبر کی ایک خنک صبح کو ــــــ اور وہ اس تاریک صبح کو کیسے فراموش کر سکتا ہے جس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی کا رخ موڑ دیا ــــــ پہلی بار جب نریندر

اس کرسی پر بیٹھا جو اب اس کے بیٹھنے سے گھس گھس کر سیاہ پڑ چکی تھی تو وہ کتنا خوش تھا۔ اس نے اپنے سب سے اچھے کپڑے پہنے تھے اور اسکے چہرے پر مسکراہٹ چمک رہی تھی۔ اس نے بڑے انہماک کے ساتھ اپنے جوتوں پر پالش چڑھائی تھی۔ لیکن بعد میں اسے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے اس بوڑھے ٹائپسٹ کی نگاہیں پسند نہ آئی تھیں۔ جس نے اپنے بدرنگ ٹائپ رائٹر سے اپنا بدرنگ چہرا اٹھاکر اپنی بدرنگ آنکھوں سے اسکی طرف تاک لیا تھا۔ اسے انپایہ سرد استقبال پسند نہ آیا تھا اور یہ جان کر سخت صدمہ پہنچا تھا کہ وہ اسکا ہم پیشہ ہے، کہ اب اسے اسی کے ساتھ کام کرنا ہے جانے اس آدمی کی آنکھوں میں ایسی کیا بات تھی کہ وہ ڈر سا گیا اور اسکی وضاحت نہ کر پایا بہت بعد میں —— تقریباً اٹھارہ برس بعد —— ان نگاہوں کا مطلب اس کی سمجھ میں آیا تھا جب اس بوڑھے ٹائپسٹ کی ریٹائرمنٹ کے بعد اسکی جگہ اسے بیٹھنے کی ہدایت ملی اور خود اسکی جگہ پر ایک نوعمر لڑکے کی تقرری کی گئی جس نے اپنے بال ٹھیک اسی طرح سے سنوار رکھے تھے۔ جس طرح وہ اپنی جوانی میں سنوارا کرتا تھا۔ اب تو اس کے سامنے کے بہت سارے بال سفید پڑ چکے تھے۔ اور تب اس کی طرف تاکتے ہوئے یکایک اسے ایسا لگا جیسے اس کی اپنی آنکھوں میں بھی کم و بیش وہی بات تھی جو اس نے اٹھارہ سال پہلے، نومبر کی ایک تاریک صبح کو، اپنے بوڑھے سپریر کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔

اس دن اسے پہلی بار پتہ چلا کہ اسکی عمر ڈھل چکی ہے۔ وہ دل ہی دل میں بہت رویا اور جب پوری عمارت سنسان پڑ گئی اور صرف ڈے گارڈ اپنے آخری دورے پر دروازے کے باہر سے گذرنے لگے تو اس نے اپنا وائلن چرمی بکس سے باہر نکالا کھڑکی کے کواڑوں کو اسکے قبضوں پر ڈھکیل کر کھول دیا اور شام کی نیلی روشنی میں غرق لان میں لہراتے ہوئے یوکلپٹس کے درختوں کی طرف تاکتے ہوئے ایک دھن چھیڑنے لگا۔ یہ وائلن اس نے دوسری جنگِ عظیم سے پہلے اپنی دوسری تنخواہ پر ایک انقلابی سے خریدا تھا جو بعد میں پولیس کی گولی کا شکار ہو گیا تھا۔ اس نے اسے سنگیت کے کچھ بنیادی اصول بتا دئے تھے اور اسے اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ ایک کاربل یا ٹدرج توڑ پھوڑ کر کسی حد تک بجا لیتا۔ وہ نوٹیشن کے طریقوں سے ناواقف تھا۔ لیکن اسکے اندر کبھی انھیں جاننے کی خواہش پیدا نہ ہوئی۔ وہ چند ٹکڑے بجا لیتا تھا اور صرف اسی کی حد تک اسے ان سے دلچسپی تھی۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ جذبات کی رو میں بہہ کر وہ ایک ایسے گیت کی تخلیق کر لیتا جو بلاشرکت غیرے

اس کی اپنی چیز ہوتی۔ مگر جوں ہی وہ وائلن اسٹک روک دیتا وہ گیت اس کے پردۂ ذہن سے اچٹ کر ہوا میں تحلیل ہو جاتا۔ اس کا رجحان وائلن کی طرف کب مرکوز ہوا، اب وہ اس واقعہ کو بھول چکا تھا لیکن جب کبھی وقت کی تیز دھوپ اس کے ملائم خوابوں کو جھلسانے لگتی، جب جب اس کے اندر کی تاریکی گہری پڑنے لگتی اور بیرونی دنیا کے خط و خال بے رحم حقیقت سے عبارت نظر آتے۔۔۔ یہ وائلن ہی اس آخری جائے پناہ ہوتا۔ اسکی کرخت آواز میں اسکے لئے امید کا سوتا ابل پڑتا اور جب وہ وائلن کو بکس میں بند کرتا تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس نے اپنی زندگی کی تمام تلخیوں، مایوسیوں اور محرومیوں کا ازالہ کر لیا ہو، انہیں اس خطۂ زمین سے کسی دوسرے سیارے میں منتقل کر دئے ہوں۔ وجدان کے یہ پر کیف لمحے نہ صرف اس کے پس منظر میں رنگ بھرتے بلکہ انھوں نے اسکی زندگی کے ڈرامے کو خود اس کے لئے حیرت انگیز حد تک قابل قبول بنا دیا تھا۔

ایک شام وہ سبت کے لئے وائلن پر کوائر کا مشق کر رہا تھا کہ اس نے سر موڑ کر دیکھا۔۔۔ شیام اپنے ٹائپ رائٹر کے سامنے کھڑا اسکی طرف توصیفی نگاہوں سے تاک رہا تھا۔ اس نے مسکرا کر اسکی آنکھوں سے آنکھیں ملا دیں۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ وائلن بکس میں ڈال کر اسکی طرف متوجہ ہوا تو اس نے دیکھا شیام اسی طرح کھڑا اسکی طرف ایک ٹک تاک رہا تھا۔

"گرچہ میں اسے سمجھ نہ پایا، مگر تم خوب بجا لیتے ہو۔" شیام نے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ دونوں آفس سے غیر متعلق کوئی بات کر رہے تھے۔

"شکریہ۔ مگر تم تو آفس کے بند ہونے کے بعد کام نہیں کرتے نا؟ آج کیسے آ گئے؟" وہ چاہتا تھا کہ شیام وائلن کا واقعہ بھول جائے۔ کبھی کبھی اسے اپنے وائلن کے لئے شرم بھی آتی تھی۔

"دنیا بہت بے رحم ہے۔" شیام نے کھڑکی سے سر باہر نکالتے ہوئے کہا جہاں اواخر ستمبر کی ہوا یوکلپٹس کے درختوں کو چھیڑ رہی تھی۔ "انسان سدا گلاب کی چھاؤں میں زندگی نہیں گذار سکتا۔"

نریندر کے دل پہ ایک گھونسا سا لگا۔ بیچارہ شیام! دھیرے دھیرے یہ تاریک ماحول اسے بھی اپنے اندر جذب کر رہا تھا۔ اور تب اسکے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اسے شیام کے اندر ایک ایسے تارِ کی سختی کا احساس ہوا جو اس حد تک اینٹھ دیا گیا تھا کہ کسی بھی لمحے ٹوٹ سکتا تھا۔ اب جب کبھی وہ اپنے وائلن کو بکس سے نکالتا شیام اپنا کام روک کر ایک مسحور تماشائی کی طرح اسکی

طرف تاکتا رہتا۔ کبھی کبھی نریندر اسے بتانے لگتا کہ کس طرح تاروں کو باندھتے وقت تھوڑی سی غلطی پر آہنگ کے بنیادی اصول درہم توڑ دیتے ہیں، کہ اس پر چڑھایا گیا وارنش اسکی فنی قابلیت میں کتنا اہم کردار ادا کرتا ہے، کہ موسیقی صرف ریاض یا مشق سے ہی نہیں، انسانی جذبات سے کہیں زیادہ مخصوص ہے۔

"اور یہ وائلن... یہ وائلن کے f نما صوتی روزن پر انگلی پھیرتے ہوئے کہتا۔ "دوسری جنگِ عظیم سے قبل روم کے تابناک سورج کے نیچے تیار کیا گیا ہے۔ اسکی آواز میں سورج کی حرارت اور زندگی موجود ہے اور جیسا کہ اسکے سابقہ مالک کا کہنا ہے اس نے انقلاب کی راہیں ہموار کی ہیں۔"

"مگر جانے کیوں جب اپنا وائلن چھیڑتے ہو تو یہ مجھے برف پوش ویرانوں کی یاد دلاتا ہے۔ تم کوئی دوسرا نغمہ کیوں نہیں چھیڑتے، کوئی ایسی چیز جو انسان کے اندر جینے کی امنگ پیدا کرے، جس سے ہمیں اس مٹی کی گرمی کا احساس ہو جس سے ہم ابھرے ہیں، جو یقین کا جواز فراہم کرے۔"

نریندر کے لئے شیام کی باتوں کو سمجھنا مشکل تھا۔ اس نے وائلن کو چرمی بکس میں بند کرتے ہوئے اسکی طرف دیکھا۔ اسے محسوس ہوا تھا جیسے یہ لڑکا اسے مذاق کا نشانہ بنا رہا ہو۔ مگر شیام کے چہرے کی طرف تاکتے ہوئے اسے اپنا خیال ترک کرنا پڑا۔ ابھی اسکی عمر ہی کیا تھی۔؟

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو،" تھوڑی دیر بعد خاموشی کو اور گہری کرتے ہوئے شیام نے کہا "سنگیت کا تعلق انسان کے جذباتی پہلوؤں سے ہے۔ تم جو گیت نکالتے ہو اسکے لئے تمہیں کوئی قصوروار نہیں ٹھہرا سکتا۔"

دھیرے دھیرے نریندر نے دیکھا شیام کی دلچسپی اب سننے تک محدود رہنے کے بجائے ایک دوسری روش اختیار کر چکی تھی۔ وہ اسکے وائلن کو چھو کر دیکھتا، اسکی ایک ایک چیز سے واقف ہونا چاہتا۔ گھومنے والی کیلوں پر زور لگا کر اسکے تاروں کو فیرل پر چڑھانے یا اتارنے کی کوشش کرتا۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ فنگر بورڈ پر تاروں کو انگلیوں کے ذریعے دبا کر ان کی لمبائی میں تخفیف یا طوالت کا مطلب صوتی نقطۂ نظر سے اس کے سرگم کا مقام تعین کرنا ہے۔ کمانی پر تنگے ہوئے ایال میں دستے کو گھما کر کس حد تک تناؤ پیدا کرنا لازمی ہوتا اور اس پر روغن کے استعمال کا طریقہ کیا ہے، نیز ریزوننٹ بکس کے f نما خانوں اور برج کا کیا مقصد ہے؟ کبھی کبھی اسکا چہرا

جوش اور تعجب سے تمتما اٹھتا اور وہ اپنے دونوں ہاتھ اپنے لمبے بالوں کی پشت پرے جاکر سامنے بیٹھے نریندر کے کمزور جسم کی طرف تاکنے لگتا۔ اس وقت اسکی آنکھیں ابتدائے آفرینش کی اس حیرت کی داستان سنائیں جو ہزاروں سال قبل کسی غیر متوقع آگ کے اندر تاکتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھلک آئی ہوگی۔

"انسان! انسان! تو کتنا عظیم ہے!" احسانمندی اسکی آنکھوں کے پردوں پر لکھی ہوتی۔ "اسکے باوجود کہ تو اس کائنات میں ایک ذرے سے بھی زیادہ حقیر ہے مگر تیری پرواز اس خالق کائنات کی طرف کتنی بے مثال ہے۔"

اذیت ناک احساسات کے تیز دھارے میں بہتا ہوا بوڑھا نریندر تلخ لگا ہوں سے سامنے بیٹھے ہوئے جذباتی نوجوان کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ زندگی بھر لوگوں سے بھاگتا آیا تھا اور انھیں پسند کرنے کے لئے اسکے پاس کوئی جواز نہ تھا۔ مگر یہ نوجوان تو قطعی ایک دوسرے گیت کی تخلیق کر رہا تھا۔ دنیا کے روشن حصوں سے تاریک کونوں کی طرف ڈھکیل دئے گئے کیڑے کس طرح انسانی عظمت کا گیت گا سکتے ہیں جنھیں ابھی بھی اجازت نہیں کہ اپنے بل سے سر باہر نکال کر سورج سے روشنی کا ایک تار حاصل کرے؟

"مجھے تمھارے بنی نوع آدم سے نفرت ہے۔" نریندر نے گویا کروڑوں میل دور ایک ایسے سیارے سے کہا جہاں دوسری نوع کے لوگ بستے ہوں۔ "اور بہت جلد تم جان جاؤگے۔"

شیام نے سہم کر اپنے سپر وائزر کی طرف دیکھا اور پھر اپنی مشین پر بیٹھ کر کام کرنے لگا۔ مگر جب بھی مشین کی بے رس کھڑکھڑاہٹ کا سلسلہ ختم ہوتا، دونوں کے پاس گفتگو کے لئے اور کوئی دوسرا موضوع نہ ہوتا۔

"تم ایک وائلن کیوں نہیں خرید لیتے؟" نریندر نے ایک دن اسے مشورہ دیا۔ "تم اپنی بے پناہ دلچسپی کے باعث بہت جلد سیکھ جاؤگے۔"

"شکریہ!" شیام نے جواب دیا۔ "لیکن میرا خیال ہے تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ اس بار مجھے میری دوسری تنخواہ ملنے والی ہے۔ پھر میں تمہیں ساتھ لے کر کسی میوزیکل اسٹور کی طرف جاؤنگا۔ تم جانتے ہو اس معاملے میں میں تو بالکل اناڑی ہوں۔"

"دوسری تنخواہ!" نریندر دھیرے سے مسکرایا۔ "میں تمہارے اندر بذاتِ خود اپنے آپ کو دیکھ رہا ہوں۔ تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی مگر یہ وائلن میں نے بھی اپنی دوسری تنخواہ سے خریدا تھا۔"

اور جاڑے کی ایک لمبی شام کو جب دونوں اپر بازار کے ایک میوزیکل اسٹور سے وائلن خرید کر باہر نکلے تو شیام کا کمزور اور خوابناک چہرا بہت مضطرب نظر آ رہا تھا۔ بغیر ایک لفظ کہے خاموشی سے چلتے ہوئے دونوں واپس آفس کے لان کے اندر پہنچ گئے جہاں سے وہ نیچے ماڈل ٹاؤن کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ عمارت سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی اور اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے لان میں دھندلے درختوں کے نیچے بھکاری آگ جلانے میں مصروف تھے۔ ایک چھوٹا بچہ اپنے ننگ دھڑنگ جسم کے ساتھ انکے آگے آگے بھاگا جا رہا تھا۔ ایک درخت کی جڑ سے ٹھوکر کھا کر وہ منہ کے بل زمین پر جاگرا۔ عمارت کے اندر تک انھیں بچے کے رونے کی آواز سنائی دیتی رہی۔ روشنی جلاکر نریندر نئے وائلن کا معائنہ کرنے لگا۔ مگر اسی دوران شیام ٹائپ رائٹر پر کاغذ چڑھا چکا تھا اور سامنے رکھے بریفیس کو گھور رہا تھا۔

"بند کرو شیام" نریندر نے سر موڑ کر کہا۔ "آؤ میں تمہیں بتاؤں کہ وائلن سے کس طرح تعارف حاصل کیا جاتا ہے۔ کیا تمہیں اتنی بڑی رقم سے ہاتھ دھونے کا ڈر ہے؟"

شیام نے حیرت سے بوڑھے نریندر کو دیکھا۔ واقعی یہ بوڑھا کتنی خطرناک حد تک لوگوں کے دلوں کی گہرائیوں تک پہنچ سکتا تھا۔ اپنی مشین کے رولر پر دونوں کہنیاں ٹکائے وہ نریندر کو تار ملاتے دیکھتا رہا۔ اپنی عادت کے مطابق بوڑھا نریندر کھڑکی کے پاس گیا اور اسے باہر کی طرف دھکیل کر کھول دیا۔ روشنی کھڑکی سے پھولوں کی جھاڑیوں پر بہہ نکلی۔ شیام کو وائلن کی کرخت آواز پسند نہ آئی۔ نریندر وائلن اسٹک کو بار بار روغن پر رگڑ رہا تھا۔ آخر کار وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور شیام کی طرف تاکنے لگا۔

"تم سیکھنا نہیں چاہتے؟"

"ایسی جلدی بھی کیا ہے؟" شیام نے کاغذ کا مارجن سیٹ کرتے ہوئے کہا اور گیئر دبا کر رین وہیل کا رخ تبدیل کیا اور ٹائپ کرنے لگا۔ نریندر کو شیام کی بے رحمی سے تکلیف پہنچی اور وہ ناخنوں سے وائلن کے تاروں کو چھیڑتا رہا۔ کاغذ بدلنے کے وقفے پر اس نے سر اٹھا کر شیام کی طرف دیکھا اور اسکے ناخنوں کی حرکت تھم گئی۔

"تم رو رہے ہو؟"

شیام نے چونک کر اسکی طرف دیکھا، مگر اسے دیر ہو چکی تھی۔ اس وقت تک اس کے آنسو بے نقاب ہو چکے تھے۔ اس نے بازو موڑ کر اس میں اپنا چہرا چھپا لیا۔

"جو کچھ میں کماتا ہوں کیا اس پر میرا اتنا بھی حق نہیں کہ میں اپنا کوئی شوق پورا کر سکوں؟"

اس نے رندھے ہوئے گلے سے کہا، "کتنا نفرت انگیز ہے یہ؟ یہ کوئی ضروری تو نہیں کہ چونکہ انھوں نے مجھے جنم دیا ہے اس لئے انھیں یہ حق مل گیا ہے کہ میری روح تک کا گلا گھونٹ ڈالیں۔"

بیچارا شیام! نریندر نے اس کے قریب جاکر اسکے ابھرے ہوئے کندھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا۔ اسے بھی ایسی ہی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مگر تم اس کے لئے کسی کو قصوروار نہیں ٹھہرا سکتے بہت بعد میں، جب تم میری عمر کو پہنچو گے تو تمہیں پتہ چلے گا کہ کیوں تمہارے والدین تمہارے خوابوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اس نے وائلن کو چرمی بکس کے اندر ڈال کر شیام کی میز پر رکھ دیا اور اپنی میز پر جاکر کام میں مصروف ہو گیا۔ ان لوگوں کے لئے، جن کی زندگی قبر تک ایک ہی سانچے میں ڈھال دی جاتی ہے۔ ان حالات سے گذرنا اتنا ہی ناگزیر ہوتا ہے کہ ان سے انحراف ناممکن ہی نہیں ہوتا بلکہ نقصان دہ بھی۔ بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہوں گے کہ کبھی کبھی زندگی پر آنسوؤں کا بھی کتنا احسان ہوتا ہے۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے پل بھر کے لئے دونوں ایک دوسرے کے بہت ہی قریب ہو گئے تھے۔

(۲)

نریندر کو یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ شیام بہت جلد اپنے وائلن سے اکتا گیا تھا۔ شاید اسکے اندر صبر کی کمی تھی۔ شاید وہ بہت جلد کسی چیز کو حاصل کر لینے یا پھر اس سے دل برداشتہ ہو جانے کا عادی تھا۔ اس فن کے لئے اسے صرف اپنی دلچسپی سے واقفیت تھی۔ اس محنت سے وہ قطعی لاعلم تھا جسے اسکے پیچھے صرف کرنا لازمی تھا۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا کہ ہفتوں شیام وائلن کا نام تک نہ لیتا۔ نریندر اسکی ہمت افزائی کی بھر مقدور کوشش کرتا۔ مگر ایسا کرتے وقت اسے اپنے کھوکھلے پن کا احساس کھائے جاتا۔ آخرکار اس نے شیام کو وائلن کی طرف ڈھکیلنا بند کر دیا۔ مگر کہیں پر اس کے دل کے اندر یہ جذبہ بیدار ہو چکا تھا کہ شیام کی یہ عدم دلچسپی دراصل اسی کے سبب تھی۔ ممکن ہے حالات

نے دونوں کو ایک دوسرے کی طرف ڈھکیل دیا ہو ورنہ انکے درمیان ایک ایسی ناقابلِ عبور خلیج ایک ایسا تضاد ہے جسے دونوں کوئی اہمیت نہ دینے کے باوجود مٹا نہیں سکتے۔ اسے ایک اذیتناک بے کیفی کا احساس ہوا جیسے طلسم ٹوٹ جانے پر۔ آدمی حقیقت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہو پاتا۔ ایک دن نریندر کو محسوس ہوا کہ پچھلے دنوں سے شیام کا وائلن اپنی جگہ سے غائب ہے۔

"گھر میں ڈال دیا ہے"، شیام نے شانے اچکا کر کہا، پھر مسکرایا، "لگتا ہے یہ اپنے بس کا روگ نہیں ——"

مگر بہت جلد نریندر کو پتہ چل گیا کہ شیام نے اس سے جھوٹ کہا تھا۔ ایک شام جب وہ سبزی مارکیٹ میں شاپنگ کے بعد سول لائنز کے راستے سے آفس کی طرف آ رہا تھا تو اس نے شیام کو دیکھا جو اپنا وائلن ہاتھ میں لٹکائے ہوئے، اسٹریٹ لیمپ کی نا صاف روشنی میں جو گل مہر، سال اور کرنج کی شاخوں سے الجھتی ہوئی نیچے برس رہی تھی، دھیرے دھیرے چلتا ہوا شہر کے مرکز کی طرف جا رہا تھا —— شاید سنگیت بھون کی طرف۔ اور تب اسے یاد آیا کہ ہر شام سات بجتے ہی کیوں شیام گھر جانے کے لئے بے چین ہو اٹھتا ہے۔ اس نے اسے آواز دینا چاہا، مگر اسکی آنکھیں دھندلی پڑ گئیں اور اسکا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ شیام اسے تقریباً چھوتا ہوا گذر گیا۔ شاید وہ جلدی میں ہونے کے سبب اسے پہچان نہ پایا تھا۔ مگر نہیں، وہ تو بہت دھیرے دھیرے قدم رکھ رہا تھا جیسے اسے کوئی جلدی نہ ہو۔ تو شیام نے اسے رد کر دیا تھا۔ اس پر اسے اعتماد نہ تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ وائلن بجا لیتا ہے مگر ممکن ہے اسکے اندر وہ مقناطیست نہ ہو کہ کسی انسان کو زیادہ عرصہ تک کے لئے اپنی طرف مائل رکھ سکے۔ یہ سوچ کر اسے سخت افسوس ہوا کہ اسی اجنبی لڑکے کے لئے اس نے اس حد تک اپنے آپ کو بے نقاب کر دیا تھا۔ اب اگر وہ واپس اپنے خول کے اندر چلا جائے بھی تو کیا۔ اسے اپنا ہر قدم بے مصرف، ہر سانس بے معنی اور ہر تصور ایک بے جان کینوس کی طرح سپاٹ نظر آنے لگا۔ زندگی میں کسی کو سمجھنا کتنا مشکل کام ہے، چاہنا کتنی تکلیف دہ، اور اس کے باوجود جانے کیوں لوگ پیار اور اپنائیت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اگر حالات انسان کو اس موڑ پر لے آئے جہاں وہ کھڑا تھا تو یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے سارے نظریات بدل نہ دے۔ مگر اسکے پاس تو بدلنے کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔ زندگی نے تو کبھی اسے اتنا موقع دیا ہی نہ تھا کہ وہ اپنے کچھ نظریے قائم کر سکتا۔ وہ تو زندگی بھر تلخ حقائق سے لڑتا رہا،

ہارتا، ان سے بھاگتا آیا تھا۔ اسکے پاس ٹھہرنے کی سکت کہاں تھی۔ نہیں، اسے اس قدر حساس نہیں ہونا چاہیے۔ دھیرے دھیرے اسکی آنکھوں کی دھند مٹنے لگی۔ اس نے اپنی ٹھنڈی گردن کو چھوکر آسمان کی طرف دیکھا جہاں ایک بھی تارا روشن نہیں ہوا تھا۔ ہوا بادل کا ایک ٹکڑا چاند پر ڈال گئی تھی۔ جس سے باہر آنے کی وہ بے مصرف سی کوشش کر رہا تھا۔ وہ آفس کے لان کا پھاٹک کھول کر اندر داخل ہو رہا تھا کہ چاندنی کا سیلاب بادل کے کناروں سے پھسلتا ہوا لان میں یوکلپٹس کے درختوں پر گرنے لگا اور اوپر عمارت کے لائٹننگ کنڈکٹر پر بیٹھا ہوا ایک پرندہ اڑتا ہوا اس پر اپنا سایہ ڈالتا شہر کے مرکز کی طرف چلا گیا۔

"تھینکس گاڈ!" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "مقدس باپ مجھے معاف کرے۔ میں اپنا یقین کھونے لگا تھا۔"

(۴)

"تو تم وائلن سیکھنے سنگیت بھون جاتے ہو؟" دوسرے دن تنہائی ملتے ہی وہ شیام کے میز کے قریب گیا۔ "کسی دن سناؤ۔ کتنے دنوں سے سیکھ رہے ہو؟"

"مجھے افسوس ہے۔ مگر میں تمہیں تکلیف دینا نہیں چاہتا تھا۔" شیام نے اسکا ہاتھ تھام کر کہا۔ "اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دو۔"

"کس لئے؟ تم اجنبیوں کی طرح بات کرنے لگے ہو۔" نریندر نے اسکا ہاتھ گرمجوشی سے دبا کر چھوڑتے ہوئے کہا۔ "مجھے خوشی ہے کہ تم اسے اپنے طریقے پر حاصل کر رہے ہو۔ کبھی کبھی انسان کو انگلی پکڑ کر چلنے کی عادت ترک کر دینی چاہیے۔"

"شکریہ" شیام نے مختصر سا جواب دیا اور اپنا کام کرنے لگا۔ وہ واپس اپنی کرسی پر چلا گیا اور شیام کے چہرے کی طرف تاکتا رہا۔ اتنی کم عمر میں کوئی کس طرح اس حد تک سنجیدہ ہو سکتا ہے ایسا لگتا ہے یہ شیام اپنی زندگی کا سب سے المناک دور جی رہا ہے۔ اسے دیکھ کر یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ کبھی اس نے کسی لڑکی کو چاہا ہوگا، اس کے جسم کی گرمی کو محسوس کیا ہوگا۔ بعض لوگ ساری زندگی یخ بستہ پہاڑوں کے درمیان گذار دیتے ہیں، انھیں سورج کی حرارت کبھی نصیب ہی نہیں ہوتی اور اس معاملے میں شیام اس سے کس قدر مشابہت رکھتا تھا۔

کرسمس کے موقع پر اس نے شیام کو دعوت دی۔ شیام کو اس سے پہلے کبھی عیسائیوں کے درمیان جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ چرچ کے اندر بنچ پر بیٹھا دیر تک عیسیٰ مسیح کی مورتی کی طرف ایک ٹک تاکتا رہا۔ یہاں تک کہ باہر پھٹتے ہوئے پٹاخوں، ڈھول، بانسری اور اکارڈین کی آواز سے بھی اس کی محویت نہیں ٹوٹی۔

نریندر کا گھر زیادہ پرانا تھا، نہ ہی دوسرے گھروں کی طرح ہوادار اور روشن تھا۔ اسکی انگیٹھی سے لے کر جس میں انگارے دہک رہے تھے، دیواروں اور فریم کے اندر سے تاکتی ماں مریم کے چہرے تک سے مفلسی کی پرچھائیاں برس رہی تھیں۔ گھر کے تمام افراد کہیں نہ کہیں جشن منانے چلے گئے تھے۔ شاید انھیں خوف تھا کہ اس گھر میں وہ کبھی کرسمس کی صحیح روح تک نہیں پہنچ سکینگے۔

"میں اس مہمان نوازی کو نہیں بھولونگا، شکریہ، بہت بہت شکریہ۔" شیام نے اجازت لیتے وقت کہا۔ "یوں مذہب میں میرا یقین کچھ زیادہ مضبوط نہیں مگر میں اس جذبے کی قدر کرتا ہوں مجھے خوشی ہے کہ تم لوگوں نے مذہب کو بدل لینے کے باوجود ہندوستانی کلچر کو زندہ رکھا ہے۔ مگر تمہیں دیکھ کر بالکل نہیں لگتا کہ تم ایک مذہبی آدمی ہو۔ مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ چرچ میں تم ہی وائلن بجاتے ہو۔ کبھی موقع ملا تو چرچ میں سنونگا۔"

"کسی بھی اتوار صبح ۹ بجے چلے آؤ۔" نریندر نے کہا۔ "میری بیٹیاں تم سے مل کر خوش ہونگی۔ ممکن ہے ان میں سے کوئی تمہیں پسند آجائے۔"

(۵)

نئے سال کے ساتھ ساتھ دونوں ایک دوسرے کے کچھ اور قریب آگئے۔ اس قربت نے انھیں ایک دوسرے کے خدوخال کو اچھی طرح سے سمجھنے کا موقع دیا تھا۔ مگر شاذونادر ہی وہ کبھی وائلن کا تذکرہ چھیڑتے اور اس وقت بھی نریندر بھر مقدور اس موضوع سے گریز کرنے کی کوشش کرتا۔ جب کبھی وہ اپنے وائلن کے تاروں کو چھیڑتا اسے شیام کی متجسس آنکھوں کا بری طرح احساس رہتا، چاہے شیام موجود ہو یا نہ ہو۔ بلکہ وہ شیام کی عدم موجودگی سے کہیں زیادہ خوفزدہ رہتا۔ اسے یہ یقین ہو چکا تھا کہ شیام کو اسکے گیتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور جو وہ اپنی مشین بند کر دیتا تو اسے محض اخلاقی فرض پر محمول کیا جا سکتا تھا۔ ایسے لمحوں میں وہ زیادہ تر شیام کو فراموش کر دینے کی کوشش

کرتا اور اس کوشش میں وہ وائلن میں اپنے آپ کو اس قدر ڈبو لیتا کہ جب اسکی محویت ٹوٹتی تو پوری عمارت کے اندر نائٹ گارڈس کے علاوہ وہی تنہا شخص ہوتا۔ وہ مشین پر غلاف چڑھا دیتا، وائلن کو اس کے بکس میں ڈال کر دیوار سے لٹکا دیتا اور دروازے کو مقفل کر کے ویران شہر کے تاریک سینے میں غائب ہو جاتا۔ بہت بعد میں، زندگی میں آنا آگے جا کر جہاں سے لوٹنا ناممکن ہوتا ہے، اسے پتہ چلا تھا کہ وہ تاریکی سے کس قدر پیار کرنے لگا تھا، کہ روشنی خوف اور حوصلہ شکن تاثرات کے سوا کچھ نہیں تھی۔ وہ تو اس قدر تاریکی پسند ہو گیا تھا کہ اپنے گردوپیش پر بھی یہ تاریکی مسلط کر دیتا — اور یہ احساس کہ چند خاص لمحوں میں تمہیں کوئی دیکھ نہیں سکتا کم از کم اس کے لئے جنت سے کم نہ تھے۔ جیسے اس کے سب سے بھیانک جرم پر پردہ ڈال دیا گیا ہو، جیسے اس کے وجود کا گناہ معاف کر دینے میں قدرت نے کوتاہی نہ برتی ہو — شاید اسی لئے دن کے وقت لوگوں کو وہ جتنی دور اور اپنے آپ میں بند نظر آتا، رات کے وقت شیام کے آتے ہی اسکی شخصیت کا بھنور باہر کی جانب بہنا شروع کر دیتا اور یہ تضاد اسکی روح کو ایک عجیب اسرار بخش دیتا جسے شیام سمجھ نہ پاتا۔ مگر کم از کم اس میں اس کے لئے ناپسند کرنے کے لئے کچھ نہ تھا۔

مگر ایک شام، جب شہر دھیرے دھیرے تاریکی کے سمندر میں غرق ہو رہا تھا، یکایک نریندر خود کو ایک اذیتناک، ناقابل گریز اور بے رحم روشنی کی گرفت میں پا کر حیران رہ گیا۔ آفس کا وقت ختم ہونے کے بعد معمول کے مطابق وہ تھوڑی دیر کے لئے گھر چلا گیا تھا۔ جب وہ واپس لوٹا تو تاریکی لان کے درختوں سے الجھ رہی تھی۔ وہ برآمدے میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا کاہنگ سیکشن کی طرف جا رہا تھا کہ اس کے کانوں میں وائلن کی دھیمی مگر کرخت آواز گونجی۔

"تو آخر کار ..." اسکا دل دھڑکنے لگا۔ وہ مسکرایا اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

شیام عین نریندر کی طرح، سخت سردی کے باوجود، کھلی ہوئی کھڑکی کے سامنے کھڑا وائلن میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ موسیقی کے سمندر میں اس قدر غرق تھا کہ دروازہ کھلنے پر بھی اس کی محویت نہ ٹوٹی۔ نریندر تھوڑی دیر تک کھلے ہوئے کواڑوں کے درمیان کھڑا اسکی طرف حیرت و استعجاب سے تاکتا رہا۔ پھر ٹٹولتا ہوا ایک کرسی کی پشت کو تھام کر کھڑا ہو گیا۔ اسکا چہرا بلب کی روشنی میں زرد

پڑ گیا تھا ، کیا یہ آواز شیام کے وائلن سے آ رہی تھی ، اور یہ دو ماہ پہلے کی بات تھی کہ ... لیکن یہ آواز ، یہ تو ایک قطعی دوسری آواز تھی ، جیسے یہ اپنے تیز اتار چڑھاؤ کے ساتھ نریندر کے خوابوں کا مذاق اڑا رہی ہو ، جیسے اسکی لئے میں ایک پرانی ، دقیانوسی ، گھٹی ہوئی دنیا کا شیرازہ منتشر کیا جا رہا ہو ، جیسے شیام اپنے وائلن کے ذریعے — جیسے یہ گیت جو شیام اپنے جذبات کی جولانیوں سے ڈھال رہا تھا ۔ یہ بتانا چاہتا ہوں کہ دراصل وہ ایک ایسے روشن اور بیکراں سیارے کا انسان ہے جو اس کائنات میں ممکن ہے اور جسے بے رحمی سے مسمار کرنے کی کوششیں اپنی تمام شدت کے باوجود اس جگہ بے کار ثابت ہوتی ہیں جہاں روح اپنے ان دیکھے قوس و قزح بکھیرتی ہے ۔ یہ سرد جنگ سے لرزاں دنیا ، یہ معاشی بدحالی کے شکنجے میں دبے ہوئے لوگ ، یہ لمحوں کے فاصلے میں بدلتی ہوئی قدریں ، یہ صدیوں کے چہروں پر پڑے ہوئے لہو کے چھینٹے ، یہ حیات نو کے چہرے کے ناخوشگوار نقوش سہی ، مگر یہی زندگی کا اصلی چہرا نہیں ۔ اس کی پوری زندگی ایک ایک لمحہ جو اس نے اس دھرتی پر بتایا تھا کتنا بڑا فریب تھا جو اس نے اپنی ذات کے حوالے کیا تھا ۔ وہ حقیقت سے بھاگتا ہوا ان پرچھائیوں کے پیچھے چلا گیا تھا جو دراصل کہیں نہیں لے جاتیں ، کوئی راستہ نہیں دکھاتیں ، سوائے اس تاریکی کے جسکا وہ شکار ہو چکا تھا ۔ اور اس کے لیے قصوروار کون تھا ؟ اب اس کے پاس کیا بچا تھا ، ایک مختصر بے کار ، مکروہ مستقبل جو دراصل قبر کی تیاری کے عمل کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ۔ اف ، یہ کتنا حیرت انگیز ہے کہ اپنی تمام تر ممکنہ پرواز کے باوجود ، اس دوری کے باوجود جو اس نے جیتے جاگتے لوگوں اور اپنے درمیان قائم کر لی تھی ، یا لا آخر وہ اور کچھ نہیں صرف کچھ کیڑوں کی خوراک بننے کے لیے جی رہا تھا ۔ جانے کب اس کے رخسار بھیگ گئے ۔ زندگی کے ۴۸ ویں سال میں اسے اس تلخ حقیقت کا پتہ چلا تھا کہ دراصل وہ جیا ہی نہ تھا ، اس نے دیدہ و دانستہ کھلی ہوا اور روشن ستاروں پر اپنے گھر کے دریچے بند کر لیے تھے ۔ اپنے نہاں خانۂ دل کو بری طرح مقفل کر لیا تھا ۔ شیام کو قریب آتے دیکھ کر اس نے اپنا چہرا دیوار کی طرف موڑ لیا ۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شیام اس کی شکست سے واقف ہو ، شاید یہ اس کی سب سے آخری اور عظیم شکست ہوگی ۔

" تم کب آئے ؟ " شیام نے اس کے پیچھے سے کہا ۔ " مجھے پتہ ہی نہیں چلا ۔ اگر تم نے مجھے بجاتے سنا ہے تو مجھے امید ہے معاف کر دو گے ۔ میں یوں ہی تھوڑی سی کوشش کر رہا تھا "

نریندر ایک گونگے انسان کی طرح اس کی طرف تاکتا رہا ۔ اس کے تمام الفاظ بجھ چکے تھے

اس نے شیام کو اپنی مشین کی جانب واپس لوٹتے دیکھا۔ ایک گھنٹہ بعد جب شیام گھر جانے
کے لیے اٹھا تو اس نے نریندر کو اسی طرح بیٹھے دیکھا۔

"تم اچھے تو ہو؟" اس نے اسے چھوتے ہوئے کہا۔ "تم گھر کیوں نہیں چلے
جاتے ______________ تم بوڑھے

ہو رہے ہو۔ تمہیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔ اب یہ اوور ورک کا چکر چھوڑ دو تم۔"

"شکریہ!" نریندر نے دھیرے سے کہا اور شیام کے قدموں کی چاپ کو باہر برآمدے
پر مدھم پڑتے سنتا رہا۔ ایک بار پھر پوری عمارت سناٹے میں ڈوب گئی تھی۔ ایک بار پھر وہ اکیلا
ہو گیا تھا۔ لیکن آج ایک بہت بڑا فرق پیدا ہو گیا تھا۔ آج اسے اپنے اکیلے پن کا احساس ستا رہا تھا۔ اسکا
جی چاہ رہا تھا کہ وہ چیخ کر شیام کو واپس بلائے۔ مگر وہ جانتا تھا، اول وہ ایسا نہیں کر سکتا، اور
پھر شیام اب تک جانے کتنی دور نکل گیا ہوگا۔ شاید اوور برج تک۔ ایسا ہی ہوتا ہے، اگر وقت
پر کسی جذبے پر غلبہ نہ پا لیا جائے تو بہت دیر ہو جاتی ہے۔ اس رات ایک لفظ ٹائپ کئے بغیر وہ عمارت
سے باہر نکل آیا، وہ جانتا تھا وہ بوڑھا ہو چکا ہے اور اس عمر میں اس بھیانک حقیقت کا انکشاف اس
کے لئے کتنا اذیتناک ہے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر شیام اسے اس کے سپنوں کے شیش محل سے کھینچ کر باہر
نہ لاتا۔ کچھ کم جاننے سے انسان کی زندگی میں کتنی زیادہ خوشیاں آ سکتی ہیں۔

اس دن کے بعد پھر کبھی اس نے شیام کو وائلن بجاتے نہیں دیکھا، مگر ہر ڈھلتی ہوئی شام
اس کے لئے کافی المناک ثابت ہوتی۔ کبھی کبھی خود اپنے وائلن سے خوفزدہ ہو کر وہ ادھر تاکنے سے گریز
کرنے لگتا۔ وہ دیکھتا کہ شیام اس کے وائلن نہ بجانے پر کتنا حیرت زدہ ہے۔ اتوار کی صبح وہ چرچ
کے اندر نہ جا سکا بلکہ اس کے پیچھے قبرستان کی تنہائی میں بیٹھا آرگن کی آواز سنتا رہا۔ اس میں اتنی
سکت نہ تھی کہ وائلن کو اس کے بکس سے باہر نکالتا۔ کون جانے، اس کے تار کیا کہہ اٹھیں! اس کے
رہے سہے سپنے بھی فنا ہو جائیں۔ شاید اس میں اب مزید خود فریبی کی سکت نہ تھی۔ اپنی اس تبدیلی
کو لوگوں سے چھپانے کے لئے وہ اور بھی تنہائی پسند ہو گیا۔ اس نے پینا شروع کر دیا۔ جسے اب تک
اس نے صرف تہوار اور تقریبات تک ہی محدود رکھا تھا۔

جاڑے میں اور بھی شدت آگئی۔ دن مختصر ہونے لگا اور آسمان سرد اور بے رحم ہوتا گیا
یہ اس کے لئے اچھا تھا کہ کام کے دباؤ کے سبب دن تیزی سے گذر جاتا اور بے روک رات اسکی منتظر ہوتی۔ لیکن اس لمبی رات کے لئے اسکی ساری محنت بے رونق ہو گئی تھی ہر صبح اپنی مختصر نیند سے جاگ کر جب وہ ننھے ننھے پرندوں کو کھڑکی سے باہر صحن پر پھدکتے دیکھتا اور جب پیچھے کے آنگن سے کنواں کی چرخی کی آواز اس کے کانوں میں آتی تو اسکا جی چاہتا کہ وہ بے اختیار ہنس پڑے مگر گذشتہ بائیس برس سے گھر کے لوگوں نے اسے کبھی کھل کر ہنستے نہیں دیکھا تھا۔ نہ جانے وہ کیا سوچ اٹھیں۔ ہر روز آفس کی طرف بڑھتے ہوئے وہ سوچتا وہ کیوں نہ اس تیز رفتار دنیا کے پرشور دھارے میں شامل ہو جائے۔ لیکن اسے فیصلہ کرنے میں اتنی دیر ہو جاتی کہ دنیا بہت آگے نکل چکی ہوتی۔
ہر قدم پر اسے آسمان بدلتا دکھائی دیتا ہر پنچ پر ایک نیا سورج طلوع ہوتا ہر سانس نئی امنگوں سے بھر پور نظر آتی مگر ہر بار کوئی سایہ سا اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔ یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا تھا کہ وہ اپنے وائلن سے ڈرنے لگا تھا اس واقعہ کے بعد اس نے کبھی وائلن کو کھول کر نہیں دیکھا تھا۔ کبھی اگر اس کے قریب چلا بھی جاتا تو اس طرح اپنی لاعلمی کا اظہار کرتا جیسے وہ اسکی موجودگی سے واقف ہی نہ ہو۔
وہ ٹائپ رائٹر کو بری طرح جھنجوڑنے لگتا۔ وہ زور سے کھڑکی کی جھلملیوں کو کھول دیتا اور لمبی لمبی سانس لیتے ہوئے لان کے درختوں کی طرف تاکتا رہتا۔ وہ کانپتی انگلیوں سے اپنے چہرے کی جھریوں کو ٹٹولتا اور آنسو دھیرے دھیرے اس کے گالوں پر بہتے رہتے۔ کبھی کبھی وہ ایک ہی زاوئے پر اتنی دیر تک بیٹھا رہتا کہ اس کے پردۂ ذہن سے ساری تصویریں معدوم ہو جاتیں اور صرف درد کی ایک ذہنیاتی لکیر باقی رہ جاتی۔ مگر یہ تمام کوششیں بالآخر اس المناک احساس کو راہ دینے لگتیں کہ دراصل وہ بھاگ رہا تھا۔ پس پردہ وہ واپس اس تاریکی کی طرف بھاگ رہا تھا جس سے دفعتاً نکل آیا تھا۔
وہ اس روشنی سے بھاگ رہا تھا جس میں اس کے خواب کرچیوں سے بکھر کر رہ گئے تھے۔ کاش... وہ سوچتا... یہ اور کچھ نہیں، محض ایک خواب ہو وہ نئے سرے سے زندگی کو اسی طرح سے جی سکے جس طرح شیام سے قبل وہ جیتا آیا تھا۔
"کیوں نہیں، اسکا انحصار تو تم پر ہے..." وہ اپنے آپ کو دلاسا دیتا۔ "زندگی کی پچاسویں خزاں میں اگر تم نے نئے تاثرات کو ٹھکرانا نہیں سیکھا ہے تو تم کچھ بھی نہیں جانتے۔ اس دور کی سب سے

اہم دریافت یہ ہے کہ ہم جتنی جلد نئے تاثرات کے جال سے باہر آسکیں، اتنا ہی اچھا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر انفرادیت کا دم توڑ دینا ناگزیر ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ تمہارے سپنوں کا مذاق اڑائے۔ انسان کو اپنے تحفظ کے لئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے۔ اسے اسکا حق ہے۔"

یکایک اس دن اس نے محسوس کیا کہ وہ واپس اپنی جانی پہچانی دنیا میں واپس لوٹ رہا ہے۔ یہ سڑکیں کتنی غلیظ تھیں، ان پر چلتے ہوئے لوگ کتنی المناک داستانوں کے خالق تھے، یہ فضا میں گونجتے ہوئے جملے کس قدر کھوکھلے تھے، یہ روشنیاں جن کے پس منظر میں تاریک سائے لہرا رہے تھے کتنی اچاٹ کر دینے والی تھیں۔ کوئی کس طرح ان سے پیار کر سکتا ہے، ان میں سانس لے سکتا ہے، لوگوں کی بھیڑ سے الگ تھلگ وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے آفس کی طرف جا رہا تھا لان کے درختوں کے درمیان سورج مکڑی کے جالے کی طرح ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا تھا۔ یوکلپٹس کے لابنے لابنے پتے راستے کی کنکریٹ پر بچھے ہوئے تھے۔ کوریڈور سے گذرتے ہوئے لابی کے اندر وہ تاریکی کو تیزی سے گہری پڑتے دیکھتا رہا۔ عمارت کی سپید دیواریں بے وجہ ہر طرف پھیلی ہوئی سی لگ رہی تھیں اور ہر قدم پر اسے نگلتی جا رہی تھیں۔ آخر کار اس نے دروازہ کھول کر سوئچ آن کر دیا۔ آہ... ہر چیز پہلے کی سی حالت میں موجود تھی جیسے منتظر ہو کہ کب وہ واپس آئے اور نئے سرے سے تار کو اس جگہ سے جوڑ دے جہاں سے ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے دروازہ اپنے پیچھے بند کر لیا وہ اتنی دیر تک خاموش اپنی کرسی میں پڑا رہا جب تک دیوار گیر گھڑی نے سات کا اعلان نہ کر دیا تو اسکا مطلب تھا شیام آج آنے والا نہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے میوزک ٹیچر کے پاس چلا گیا ہوگا۔ اس کے باوجود کہ سردی پورے شباب پر تھی اس نے ایک جھٹکے سے چٹخنیاں گرا دیں اور کھڑکی کے کواڑوں کو باہر کی طرف ڈھکیل دیا۔ رات روشن تھی چاند جیسے کسی تنور سے روٹی کی مانند تپ کر نکل آیا تھا۔ ایک ایسی روٹی جو بے احتیاطی کے سبب جگہ جگہ سے جل گئی ہو۔ ایک دو تارے آسمان میں بے اعتنائی سے چمک رہے تھے نیچے درختوں کے درمیان ہوا سرسرا رہی تھی۔ لان میں بھکاریوں کی جلائی ہوئی آگ کا دھواں اوپر کھڑکی تک پھیل رہا تھا۔ اس نے وائلن کو دیوار سے اتار لیا۔ آہ.... اس پر گرد کی تہہ جم گئی تھی، مگر بکس کے اندر سے وائلن صاف شفاف اور چمکدار نکل آیا، جیسے نریندر کے وجود سے لپٹے ہوئے اس کے سپنے۔ اس نے کھڑکی کی شیشے کی جھلملیاں

بند کر دیں جنھوں نے روشن آسمان کو چوکور دھندلے خانوں میں منقسم کر دیا۔ اسٹول پر اپنا
داہنا پاؤں رکھ کر وہ تاروں کو کستا رہا۔ اسکی انگلیاں اس جوان لڑکے کی مانند کانپ رہی تھیں
جسے پہلی بار کسی لڑکی کا سینہ چھونے کا موقع مل گیا ہو۔ سخت سردی کے باوجود پسینہ اس کے بالوں
کے اندر سے پھوٹ نکلے۔ آخر کار اس نے وائلن اسٹک کو تار پر دوڑا دیا۔ نہیں، شاید کوئی تار
غلط کس گیا تھا وہ اسے درست کرنے لگا۔ اس نے ایک ایسی دھن چھیڑ دی جسے وہ جوانی سے بجاتا
آیا تھا اور جس پر اسے مکمل عبور حاصل تھا۔ اس کے باوجود کہ اسکی آواز اتنی ہی کرخت اور ماند سی
تھی۔ مگر کہیں پر کوئی کمی سی رہ گئی جسے وہ سمجھ نہ پا رہا تھا، مگر جو اپنی موجودگی کا احساس اسے بری
طرح دلا رہی تھی۔ وہ کوشش کرتا رہا۔ وہ زیادہ جذباتی ہونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنے ساز پر حاوی
ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ایک دوسرا گیت چھیڑ دیا۔ مگر وہ کمی اس نئے گیت میں بھی موجود تھی۔
اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی نیا عنصر اس کے گیتوں میں آگیا ہو۔ جیسے اب اس کے گیت خود
اس پر مسکرا رہے ہوں، بلکہ ہنس رہے ہوں، اس نے اپنا اعتماد ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ مگر وہ
اپنی کوشش میں جتنی شدت پیدا کر رہا تھا اسے اس کے کھوکھلے پن کا اتنا ہی احساس ہو رہا تھا
جیسے وہ اپنی مرضی کے خلاف بری طرح کسی کھائی کے اندر ڈھکیلا جا رہا ہو۔ ایک ایک انچ زمین
سے اس کے پیروں کی گرفت کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ وہ چٹان کے آخری سرے پر پہنچ گیا تھا۔ جس
کے نیچے ہزاروں میٹر گہری اندھی کھائی تھی، جس کی اندھی تہہ سے کوئی بھی واقف نہ تھا۔ اسے ہوا کے
سرد تھپیڑوں کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ اس نے واپس بھاگنے کی کوشش کی مگر کھائی کسی مقناطیسی
عمل کے تحت اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی ـــــ وہ توازن برقرار رکھنے کے لئے گھٹنوں کے بل
زمین پر بیٹھ گیا اور ہتھیلیوں کو پھیلا کر چٹان کی چکنی سطح کو پکڑنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ مگر
زمین اس کے گھٹنوں کے نیچے سے نکلتی چلی گئی، چٹان کی چکنی سطح پر اس کی انگلیاں پھسلتے پھسلتے
خود اپنے خون میں نہاتی ہوئی آخر کار خلاء میں تیر گئیں۔ اس نے خود کو خلاء میں معلق محسوس کیا۔
ایک تیز چیخ... اور کسی چیز کے ٹوٹنے کی بھیانک آواز پر اس نے آنکھوں کو کھول کر دیکھا۔ وہ
بلب کی تیز روشنی میں غرق کھڑا تھا۔ سخت سردی کے باوجود اسکا پورا چہرا پسینہ میں ڈوبا ہوا تھا
اس نے جھک کر دیکھا۔ وائلن کے تمام تار صحیح سلامت تھے۔ مگر وہ تار جو اس کے اندر موجود تھا،

جو صحیح معنوں میں اسکی زندگی کا محرک تھا ٹوٹ چکا تھا۔ وہ اس کے ٹوٹنے کی اذیتناک جھنکار کو اپنی رگ رگ میں سن رہا تھا۔

وہ لڑکھڑا گیا۔ وائلن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر میز پر جا گرا۔ اپنی کرسی پر ڈھیر ہو کر اس نے چہرا دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

(۷)

شہر میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ لوگ سکریٹریٹ کے وسیع و عریض لان میں بھیڑ لگانے لگے جہاں ایک نوجوان ٹائپسٹ کا خون ہو گیا تھا۔

سب انسپکٹر جب ڈپٹی کمشنر کے ساتھ اندر داخل ہوا تو وہ مقتول کے سرہانے کھڑا اسکا سگریٹ پی رہا تھا اور اپنی انگلیوں کے اشارے سے انھیں کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ نوجوان ٹائپسٹ کی لاش خون سے شرابور کرسی پر پڑی تھی۔ اسکا سر کرسی کے داہنے بازو پر جھکا ہوا تھا اور اس کی پشت میں ایک چھری دستے تک پیوست تھی۔

"کہیں یہ خون آپ نے تو نہیں کیا ہے مسٹر نریندر ؟" سب انسپکٹر نے قاتل سے دریافت کیا۔ مگر وہ جواب میں مسکراتا رہا۔ سب انسپکٹر نے پلٹ کر ڈپٹی کمشنر کی طرف دیکھا اور افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے سر، یہ انھیں کا کام ہے۔ مگر اب یہ پاگل ہو چکے ہیں۔"
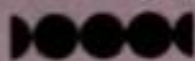
عقاب کا سایہ

ماقبل تاریخ کے انسانوں کی کہانی

پیٹھ پر ہرن کی لاش اٹھائے وہ اکیلا تپتی چٹانوں کے درمیان چل رہا تھا۔ اسکی گھنگریالی قرمزی داڑھی سے گرم ہوا الجھ رہی تھی اور اس کی گہری نیلی آنکھوں سے آسمان کی بیکراں وسعتوں کا اسرار جھانک رہا تھا۔ وہ اپنے ننگے جسم کو جس کسی زاویئے سے متعارف کر رہا تھا وہ اسکے نصب العین کے لئے بجائے خود ایک اچھا جواز فراہم کر رہا تھا۔

"ای ای ای یا وو وا" اس نے چلا کر کہا۔

ایک عقاب اپنے شہ پر تولتا اس کے سر پر اڑنے لگا۔ وہ اس کے گرد ایک دائرے کی شکل میں اڑ رہا تھا جب جب عقاب کا سایہ اسکے چہرے پر گرتا وہ اپنے جسم کو ایک غیر ضروری بل دے کر تھم جاتا۔ پھر چل پڑتا اور تھم جاتا۔ عقاب اس کے گرد ایک ہالاں کی صورت میں چکر لگاتا ہوا دھیرے دھیرے اوپر، اوپر اور اوپر آسمان کے نیلے پن میں ڈوبتا گیا یہاں تک کہ وہ ایڑیوں کے بل اٹھ کر بھی اسے دیکھ نہ سکا اور وہ تپتی چٹانوں کے درمیان اکیلا چلتا رہا اور ہرن کا سر اسکے کندھے سے سامنے کی طرف جھولتا رہا۔ تپتی چٹانوں کا سلسلہ ختم ہوگیا اور یکایک وہ ایک پتھریلے میدان میں پہنچ گیا جہاں عورتیں اپنی ٹانگوں کے درمیان بچوں کو لٹکائے کھڑی تھیں اور بوڑھے نوکیلے پتھروں کے ڈھیروں کے سامنے بیٹھے خشک ہڈیاں چوس رہے تھے۔

"ہای ہی ہی یا وووا" اس نے کہا۔

"یا وووا ای ہی ہی" عورتوں نے کہا۔

"وووا ای ہی یا" بوڑھوں نے ہڈیوں کو زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔

اس نے ہرن کو زمین پر پھینک دیا اور چٹانوں کو پھلانگتا ہوا پانی کے چشمے کے قریب پہنچ گیا وہ ایک پل کیلئے ایک گڑھیا کے کنارے ٹھہر گیا جس میں نیلے آسمان کے پس منظر میں اسکا ننگا جسم لرزتا نظر آ رہا تھا۔ اس نے گھٹنوں کے بل جھک کر ہتھیلی سے اپنا عکس مٹا دیا اور پانی کی سطح سے منہ لگا کر پینے لگا۔

وہ پانی پی کر پلٹا تو اس وقت تک ہرن کا گوشت لوگوں میں تقسیم ہو چکا تھا باقی بچے ہوئے گوشت کو ہرن کی کھال میں سمیٹ کر وہ پہاڑ کے اوپر چڑھنے لگا۔

ایک عورت اپنے گوشت کے ٹکڑے سے منہ اٹھا کر اسے اوپر جاتے دیکھ رہی تھی جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے فرازِ کوہ کی طرف چل پڑی۔

بوڑھوں نے دونوں کو آگے پیچھے اوپر کی طرف جاتے دیکھا اور ہنس کر اپنی ٹانگوں کے درمیانی حصے کی طرف اشارا کیا۔

"ہی ہی ہے اووو" انھوں نے کہا۔

رات گرم تھی۔ چاند نکل آیا تھا۔ عورت نے اپنی آنکھوں کو کھول کر دیکھا۔ وہ سامنے ایک پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھا دور گہری وادی میں تاک رہا تھا۔ وہ اٹھ کر اپنے گھٹنوں پر چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچی۔ مرد نے مڑ کر اسکی طرف دیکھا اور اپنا بازو اس کی کمر کے گرد پھیلا کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ دیر تک اسے پیار کرتا رہا۔ اس کے اندر، بہت اندر تک اپنے وجود کی گرمی پہنچاتا رہا۔ عورت کی وا آنکھوں میں تارے روشن ہوتے جا رہے تھے اور اس کے اندر کی تاریکی میں بھی یہ تارے جھلملا رہے تھے، اور مرد کے ہاتھ اس کے جسم کے ان تمام رازوں کو بے نقاب کر رہے تھے جن سے وہ خود بھی ناواقف تھی۔ پھر عورت نے خود کو زمین اور آسمان کے درمیان معلق پایا۔ یہ کیفیت چند لمحے تک رہی پھر وہ گرنے لگی۔ اسکی آنکھوں سے آسمان اپنے تاروں سمیت اوجھل ہو گیا اور وہ ایک جاوداں تیرگی میں ضم ہو گئی۔

مرد اس کے مردہ جسم کو دیر تک سینے سے لگائے دور گہری وادی میں تاکتا رہا پھر مسکرا کر

اسے اپنی باہوں میں اٹھالیا۔ وہ چٹان کے آخری سرے پر پہنچا اور اس نے عورت کے جسم کو قعرِ فنا میں غرق کر دیا۔

صبح کی روشنی میں عورتیں، بوڑھے اور لڑکے خاموش کھڑے اسے فرازِ کوہ سے نیچے اترتے دیکھتے رہے۔ نیچے اتر کر وہ ایک پستہ قد جوان عورت کے قریب ٹھہر گیا۔ پھر اسے اپنے قریب کھینچ کر اس کے سینے کو چومنے لگا۔ جوان لڑکے چٹانوں کو پھلانگتے ہوئے اوپر پہاڑ پر چلے گئے۔ انھوں نے قعرِ فنا کے کنارے رک کر نیچے کی طرف نظر دوڑائی پھر مڑ کر چلاتے ہوئے کہا۔

"یاپایاپا گیا یا اے ے ے"

بوڑھے منہ جھکا کر ہڈیاں چوسنے لگے۔

عورتیں اپنی ٹانگوں کے درمیان بچوں کو جھلانے لگیں۔

(۲)

پیٹھ پر خنزیر کی لاش اٹھائے وہ برف پوش چٹانوں کے درمیان چل رہا تھا۔ اسکی گھنگریالی، قرمزی داڑھی سے سرد ہوا الجھ رہی تھی اور اسکی گہری نیلی آنکھوں سے آسمان کا پتھریلا پن ٹپک رہا تھا۔ وہ اپنے ننگے جسم سے نکلتے ہوئے دھوؤں کے ساتھ جس سمت بھاگتا نظر آ رہا تھا وہ اس کے نصب العین کو بجائے خود ایک جواز فراہم کر رہا تھا۔

"ای ی ی یا ووو ا" اس نے چلا کر کہا۔

ایک عقاب اپنے شہ پر تولتا ہوا اس کے سر پر اڑنے لگا۔ اس نے چہرا اٹھا کر اسکی طرف نہیں دیکھا۔ عقاب اسکے گرد دائرے میں اور پھر ہلال کی شکل میں اڑتا رہا، پھر وہ اوپر، اوپر، بہت اوپر ہوتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ یہاں تک کہ برف میں دھنستے ہوئے اس کے پیر ساکت ہو گئے۔ پھر سر جھٹک کر وہ چل پڑا۔ خنزیر کا جسم بھاری تھا اور اس کا ٹکوناسر اس کے کندھے سے سامنے کی طرف لٹک رہا تھا۔

برف پوش چٹانوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور یکایک وہ درختوں کے ایک جھنڈ میں پہنچ گیا جہاں عورتیں بچوں کو گودیں لئے گرمی پہنچا رہی تھیں اور اپنے پستانوں سے ان کے چہروں کو ڈھک رہی تھیں اور بوڑھے اپنی ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے گرمی پہنچا رہے تھے اور اوپر شاخوں

میں جمی ہوئی برف کی طرف خوفزدہ نظروں سے تاک رہے تھے جوان کے لئے چھت کا کام دے رہے تھی۔

"ای ای یا وو وا" اس نے کہا۔

"یا وو وا ای ای" عورتوں نے کہا۔

"وو وا ای ای یا" بوڑھوں نے خوفزدہ نظروں سے شاخوں کے درمیان جمی ہوئی برف کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔

اس نے خنزیر کی لاش کو برف پر ڈال دیا اور گیلے تنوں کو ہتھیلیوں سے محسوس کرتا ہوا جھنڈ کے پار نکل آیا جہاں برفاب چٹانوں کے درمیان پانی کے گرم چشمے سے دھوؤں کا طوفان ابل رہا تھا۔ اپنے ننگے جسم کے گرد دھوؤں کی گرمی کو وہ تھوڑی دیر تک محسوس کرتا رہا۔ پھر اس نے چشمے سے گرم پانی ہتھیلیوں کی پیالی میں اٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

وہ پانی پی کر پلٹا تو اس وقت تک خنزیر کا گوشت لوگوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ باقی بچے ہوئے گوشت کو ریچھ کی کھال میں سمیٹ کر وہ جھنڈ سے باہر کی طرف چل پڑا جہاں پہاڑ کے نیچے ایک غار اس کے لئے مخصوص تھا۔

پستہ قد جوان عورت نے گوشت کے چربی دار ٹکڑے سے منہ اٹھا کر اسے مخصوص غار کی طرف جاتے دیکھا اور وہ بھی اسکے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ بوڑھوں نے دونوں کو جھنڈ سے غائب ہوتے دیکھا اور ہنسکر اپنی ٹانگوں کے درمیانی حصے کی طرف اشارا کیا۔

"ہی ہی ہے او وو" انھوں نے کہا۔

درختوں کے جھنڈ میں عورتیں، بوڑھے اور لڑکے شاخوں سے چھن چھن کر آتی ہوئی سورج کی روشنی میں نہا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے مرد کو جھنڈ کے اندر داخل ہوتے دیکھا۔ جھنڈ کے اندر آ کر وہ ایک سیاہ فام، بے انتہا خوبصورت اور خطرناک حد تک جوان لڑکی کے قریب ٹھہر گیا۔ پھر اسے اپنے قریب کھینچ کر اس کے ملائم سینے کو چومنے لگا۔ لڑکی اس کے کان کی لوؤں پر اپنی انگلیاں رگڑ رہی تھی۔ جوان لڑکے جھنڈ سے نکل مخصوص غار کے اندر گئے اور پستہ قد عورت کی لاش کو برف پر گھسیٹتے ہوئے باہر آئے۔

عورت کا سر ایک بھاری پتھر سے کچل دیا گیا تھا۔

وہ لاش کو جھنڈ سے واپس باہر لے گئے اور برف کے اندر دبا دیا وہ پلٹ کر جھنڈ کے اندر آئے اور اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر چلائے

"یاپایا گیا یا اے ے ے"

بوڑھے سر جھکا کر ہتھیلیاں رگڑنے لگے۔

عورتیں اپنے پستانوں سے بچوں کے چہرے ڈھکنے لگیں

(۳)

بارش ہو رہی تھی اور پشت پر ڈولفن کی لاش اٹھائے وہ ساحل کی چٹانوں کے درمیان چل رہا تھا۔ اس کی گھنگریالی، قرمزی داڑھی سے بارش کا پانی بہہ بہہ کر گردن اور سینے کی طرف جا رہا تھا اور اسکی گہری نیلی آنکھیں پانی کی رنگت سے گھل مل گئی تھیں مٹی پر سختی اور احتیاط سے قدموں کو رکھتے ہوئے وہ جس چستی اور چوکنے پن سے آگے کی طرف بڑھ رہا تھا وہ اس کے نصب العین کے لئے بجائے خود ایک اچھا جواز فراہم کر رہا تھا۔

"ای ای یا ودوا" اس نے چلا کر کہا۔

ایک عقاب اپنے شہپر تولتا اس کے سر پر اڑنے لگا۔ اس نے سر اٹھا کر اسکی طرف دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی کیونکہ بارش کے سبب وہ اوپر نہیں تاک سکتا تھا۔ عقاب بارش سے پریشان تھوڑی دیر تک اسکے سر پر منڈلاتا رہا، پھر اوپر، اوپر، بہت اوپر ہوتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ یہاں تک کہ ایک گڑھے کو پھلانگتے پھلانگتے اسے ٹھہر جانا پڑا۔ پھر سر جھٹک کر وہ چل پڑا۔ ڈولفن کا جسم وزنی تھا اور اس کی تھوتھنی اس کے کندھے سے سامنے کی طرف گری ہوئی تھی۔

سمندر بہت پیچھے چھوٹ گیا تھا۔ دھیرے دھیرے عفریت نما، بڑی بڑی عمودی چٹانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک آسمان کو چھوتی ہوئی عمودی چٹان کے نیچے وہ نکل آیا جہاں عورتیں بچوں کو دودھ پلا رہی تھیں اور بوڑھے اپنی قدیم و پراسرار آنکھوں سے دور ایک آبشار کی طرف تاک رہے تھے، جو جھاڑیوں کے درمیان ایک مربع نما آئینے کی طرح نظر آ رہا تھا۔

"ای ای یا ودوا!" اس نے کہا۔

"یاوووا ای ای ای" عورتوں نے کہا۔

"وووا ای ای یا" بوڑھوں کی نگاہیں ایک پل کے لئے آبشار کے آئینے سے ہٹ گئیں۔

ڈولفن کو زمین پر پھینک کر وہ آبشار کی طرف چلا گیا اور اسکے نیچے کھڑا دیر تک نہاتا رہا۔ جب وہ واپس پلٹا تو ڈولفن کا گوشت لوگوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ باقی بچے ہوئے گوشت کو ہرن کی کھال میں سمیٹ کر وہ سب سے الگ ایک عمدہ چٹان کے نیچے چلا گیا جو کافی فاصلے پر واقع تھی۔

خوبصورت اور جوان سیاہ فام لڑکی نے ڈولفن کے گوشت کا ٹکڑا چباتے چباتے اسے دور جاتے دیکھا اور وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ بوڑھوں نے دونوں کو ایک دوسرے کے پیچھے غائب ہوتے دیکھا اور اپنی ٹانگوں کے درمیانی حصے کی طرف اشارا کیا۔

"ہی ہی ہی ہے اووو" انھوں نے کہا۔

(۴)

صبح ہو چکی تھی۔ تاروں کی پتھروں جیسی بے جان روشنیوں کے درمیان سورج نکل آیا اور بارش سے دھلے ہوئے آسمان کے نیچے عمودی چٹانیں قیمتی پتھروں کی طرح چمک اٹھیں۔ تمام لوگ دھوپ میں نکل آئے تھے اور انھوں نے اپنا رخ اس چٹان کی طرف کر رکھا تھا جہاں سے اسے ابھرنا تھا۔ بوڑھے اپنی ٹانگوں کے ورم سہلا رہے تھے، عورتیں بچوں کے سر کھجلا رہی تھیں یا انکے جنسی عضلات سے کیڑے بھگا رہی تھیں اور جوان لڑکے اپنی لمبی پرچھائیوں کی طرف تاک رہے تھے۔

پھر چٹان کے نیچے سے ایک انسانی جسم نکل آیا۔

مگر یہ سیہ فام لڑکی تھی۔

اسے دیکھتے ہی بوڑھے اپنے ورم سہلانا بھول گئے، عورتوں کے ہاتھ بچوں کے جنسی عضلات پر تھم گئے اور جوان لڑکوں کے سائے لرز لرز سے گئے۔

سیاہ فام لڑکی ان کے سامنے آ کر ٹھہر گئی اور سہمی سہمی سی انکی طرف تاکنے لگی۔

"گیلے لے لے رووو میا" بوڑھوں نے کہا۔

"گیلے لے لے رووو میا" عورتوں نے کہا۔

"گیلے رے رووومپا"، لڑکوں نے کہا۔
اس خاموشی میں صرف بچوں کے کلکلانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یکایک نوجوان لڑکے اس عمودی چٹان کی طرف دوڑے اور اس کے نیچے سے مرد کے جسم کو گھسیٹتے ہوئے نکل آئے جس کی ٹانگوں کے درمیان خون کا ایک بڑا سا لوتھڑا جھول رہا تھا۔
"بوگولولوروونا ہ" بوڑھوں کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں جاگ اٹھیں۔
"بوگولولوروویا ہ" عورتیں اپنے بال نوچنے لگیں۔
"بوگولولوروڑنا ہ" نوجوان لڑکے اسکی طرف لپکے۔ بے شمار پیاسے ہاتھ لڑکی کو ٹکڑوں میں بدلنے کے لئے خلاء میں تیر گئے۔ لڑکی مڑکر بھاگی۔ وہ بری طرح چیخ رہی تھی اور چٹانوں کے درمیان بھاگتی ہوئی وہ کسی میمنے کی طرح نظر آرہی تھی جسکے تعاقب میں خونیں بھیڑیوں کا ایک غول دوڑ رہا تھا ـــــ
وہ لوگ سمندر کی طرف بھاگ رہے تھے۔ لڑکی مڑکر ایک عمودی چٹان پر چڑھتی چلی گئی اور اس کے اوپر سے گذر کر ایک دوسری عمودی چٹان پر کود گئی۔ اس چٹان کے زیریں حصوں پر پانی ہلکورے لے رہا تھا۔ وہ پانی میں کود گئی وہ تیرتی ہوئی تھوڑی دور ہی جا پائی تھی کہ اس نے چٹان کے اوپر سے بہت سارے جسموں کو پانی میں غوطہ لگاتے دیکھا۔ وہ ایک کائی زدہ چٹان کو تھام کر اسکے اوپر سے ہوتی ہوئی پانی سے باہر نکل آئی۔ اب وہ ایک تنگ سے درّے میں بھاگ رہی تھی جو بتدریج اوپر کی طرف چڑھتا چلا رہا تھا۔ اسے اپنے بہت پیچھے دوڑتے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ اس نے مڑکر دیکھا اور اسے درّے کے تکونے خلاء میں سمندر کا نیلا پھیلاؤ دکھائی دیا۔ وہ درّے سے کنارے کی چٹان پر چڑھ گئی اور بدقت تمام اسے عبور کرکے اس کے اوپر بھاگنے لگی۔ اب اس کے نیچے درّہ بہت ہی گہرا اور خطرناک ہوتا جا رہا تھا۔ آخرکار وہ تھم گئی اور اس کے ساتھ ہی پیچھے سے دوڑنے کی آواز بھی غائب ہوگئی۔ وہ درّے کے کنارے سے کچھ اوپر ہٹ گئی اور چٹان کی سخت سطح پر خود کو گرا کر گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ اسکی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔ وہ چٹان پر لیٹی لیٹی نیلے آسمان کی طرف تاکتی رہی۔ پھر کہنیوں کے بل اٹھ کر رینگتی ہوئی کنارے تک آئی اور نیچے درے میں تاکنے لگی۔ یہ درّہ بہت تنگ

تھا اور دونوں طرف گرینائٹ کی چٹانوں کی دیوار کھڑی تھی۔ وہ کہنیوں کے بل کچھ اور اٹھ کر نیچے درّے میں تاکنے لگی جہاں اسے ایک بہت ہی خوفناک منظر نظر آیا۔

ـــ ایک اجگر درّے کے اندر لیٹا ہوا دھوپ کھا رہا تھا۔ اس کی کھال دھوپ میں چکنی اور بے انتہا خوبصورت نظر آرہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی کے تاک میں وہاں بیٹھا تھا۔ لڑکی نے سر اٹھا کر اپنے گرد نظر ڈالی۔ اسے ایک بہت بڑے سے پتھر کی تلاش تھی جو اسے قریب ہی پڑا مل گیا۔ یہ پتھر اس قدر بڑا تھا کہ دونوں ہاتھ اس کے گرد پھیلا کر بھی وہ اسے اٹھا نہ سکتی تھی۔ مگر اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ اس پتھر سے اپنی قسمت آزمائے۔ وہ پتھر کو کنارے کی طرف ڈھکیلنے لگی۔ پہلے تو پتھر ٹس سے مس نہ ہوا، پھر دھیرے دھیرے ہلتا ہوا کنارے کی طرف سرکنے لگا۔ ایک بار اپنی جگہ سے ہٹنے کے بعد اسکا لڑھکنا آسان ہوگیا۔ لڑکی اسے لڑھکاتے ہوئے کنارے لے گئی۔ نیچے اجگر ساکت و جامد پڑا دھوپ کھا رہا تھا۔ اپنی تمام قوت سلب کر کے اس نے پتھر کو ایک زوردار دھکا دیا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر نیچے تاکنے لگی۔

پتھر کنارے کی چٹانوں سے ٹکراتا ہوا، چنگاریاں چھوڑتا ہوا، اجگر کے دھڑ پر سر کے عین پچھلے حصے پر گرا تھا اور اس کے سر کے پرخچے اڑاتا ہوا درّے میں لڑھکتا چلا گیا تھا۔

وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی اور زور زور سے ہاتھ لہرا کر چلانے لگی۔

"ہے ہے یو یو یو آمیا"

اس نے اپنے تعاقب میں دوڑتے لوگوں کو درّے کے اندر پایا۔ وہ اجگر کے مردہ جسم کے سامنے کھڑے ہانپ رہے تھے۔ انھوں نے سر اٹھا کر اوپر لڑکی کو ناچتے دیکھا اور اپنے ہاتھ سر سے اوپر اٹھا کر اپنی خوشی کا اعلان کیا اور اجگر کی لاش کو درّے سے باہر نکالنے میں مصروف ہو گئے۔

(۵)

سمندر کے کنارے رات روشن تھی۔

بوڑھے لڑکے اور عورتوں نے مل کر پیٹ بھر کر گوشت کھایا تھا اور اب چپ چاپ بیٹھے سمندر کی سرگوشی سن رہے تھے۔

سیاہ فام لڑکی تھوڑی دیر تک چاند کی طرف تاکتی رہی۔ پھر ایک جوان لڑکے کے قریب جاکر اپنی باہیں اسکے گرد پھیلا دیں۔ دونوں ایک دوسرے کو چومتے اور ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہوتے ہوئے سمندر کی طرف چلے گئے۔

اور ایک بار پھر صبح ہو گئی۔ سمندر کا پانی دھوپ میں جل اٹھا۔ چٹانوں کے زیریں حصّوں میں سے وہ لوگ جاگ کر باہر نکل آئے۔ بوڑھے دھوپ میں اپنے ہاتھ پاؤں پھیلانے لگے۔ عورتیں بچّوں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ اور لڑکے چٹانوں کے درمیان چلتے ہوئے صبح کی ٹھنڈی ہوائیں لمبی لمبی سانسیں لینے لگے۔

سورج سر پر نکل آیا۔

مگر لڑکی واپس نہیں لوٹی۔

نہ ہی لڑکا واپس آیا۔

تمام لوگوں کے چہروں سے تشویش کا رنگ ٹپکنے لگا۔ لڑکے چھلانگ لگاتے ہوئے سمندر کی طرف گئے اور واپس آکر انھوں نے اطلاع دی۔

"یا یا یا او وو نے نانی!"

دن کا نصف حصّہ بیت گیا۔ انکے جسم دھوپ سے گھبرا کر ایک بار پھر چٹانوں کے زیریں حصّوں میں چلے گئے۔ پھر دن دم توڑنے لگا۔ عورتیں بچّوں کو چھوڑ کر باہر نکل آئیں۔ بوڑھے زمین پر ہاتھ رکھ کر غصّے سے کانپنے لگے اور لڑکے عورتوں کے جسموں کو قریب آنے سے روکنے لگے۔ مگر عورتیں مقابلتاً زیادہ طاقتور تھیں۔ بوڑھے روتے ہوئے بچّوں پر غراتے رہے۔ لڑکے عورتوں کے جسموں کے عتاب جھیل کر نکل آئے۔ عورتیں بچوں کے پاس واپس لوٹ گئیں چٹانوں کے سائے سمندر کی طرف پھیلنے لگے۔ سمندر گہرا نیلا ہوتا گیا۔ موجوں کے شور میں صفتی کی سی مٹھاس آگئی اور ہوا میں اڑتے ہوئے پرندے خوبصورت نظر آنے لگے۔ کسی عورت نے ایک چٹان سے اپنے جسم کو ٹکا کر اپنے سینے اندر کو بل دینا شروع کر دیا اور ایک لڑکا اسکی پھیلی ہوئی ٹانگوں کے درمیان ٹھہر کر اس کے کندھوں کو چومنے لگا۔

مگر وہ زیادہ دیر تک جسم کو بل نہ دے سکی۔

اسے ساکت ہوتے دیکھ کر لڑکے نے سر موڑ کر دیکھا۔

تمام لوگ حیرت و استعجاب سے ایک ہی سمت تاک رہے تھے۔

ان کے سامنے سیاہ فام لڑکی اور نوجوان لڑکا کھڑے تھے۔

لڑکی کے کندھے پر ایک بارہ سنگھا لدا ہوا تھا۔ لڑکے نے کندھے پر ڈولفن کی لاش اٹھا رکھی تھی اور دونوں نے ایک عقاب کی لاش کو اس کے شہپروں سے پکڑ کر اس طرح لٹکا رکھی تھی کہ دونوں پھیلے ہوئے پروں کے درمیان عقاب کا خون آلود سر زمین کو چھو رہا تھا۔

●●●●
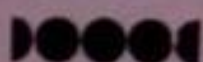
پُل کے اُوپر

عادل نے اپنی ہتھیلیوں کو پُل کے ریلنگ پر رکھ کر میری طرف دیکھا۔

"تم کہو تو میں ابھی اور اسی وقت یہاں سے نیچے پٹریوں پر کود سکتا ہوں۔ تم اسکا جو جی چاہے معاوضہ دو، مگر میری ایک شرط ہے کہ اگر میں بچ گیا تو تم اپنی راہ چل دو گے۔ تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیئے کہ میرے مڑے تڑے جسم پر کیا گذری۔"

عادل تم زیادہ ہی پی گئے ہو، میں نے کہا۔ "خیر آؤ! میں تمہیں ایک ایسے آدمی سے ملانا چاہتا ہوں، جس سے میری برسوں کی جان پہچان ہے مگر جسے میں نے آج صبح چرچ روڈ پر نئے سرے سے دریافت کیا ہے۔ اگر اس وقت تم نے اس سے مل نہ لیا تو پھر کبھی مل نہ پاؤ گے۔"

"بکواس بند کرو۔ میں جانتا ہوں، یہ آدمی اپنی بیوی کی نیوڈ پینٹنگز بیچتا ہے اور فرصت میں اسکی موچھیں ربڑ سے بناتا ہے۔"

مجھے حیرت ہوئی۔ تو عادل مجھ سے بھی بڑا آوارہ گرد نکلا۔

ایک پرانی، دقیانوسی ماڈل کی کار گذر گئی۔ دھواں کی غلیظ بو ہمارے اندر پھیلنے لگی اور نیچے شہر کی سڑکوں پر سائے پھیکے پڑتے گئے۔ عادل نے اپنے سر سے اُونی ٹوپی اتار کر اسکے اندر تاکا، گرد جھاڑی اور واپس سر پر ڈال لیا۔ یکایک میں نے محسوس کیا کہ اسکی ڈسکو شرٹ بری طرح گھس گئی تھی اور پتلون کے زیر آہن کے ذریعے آپس میں منسلک تھے۔

"اور تم جس آدمی کا ذکر کر رہے ہو وہ اور کوئی نہیں، میں ہوں۔" وہ خوش خلقی سے مسکرایا۔ "تو آج

میں تمہیں اپنی بیوی کے پاس لے چلتا ہوں۔ یہی نا کہ تم اسکی نیوڈ پینٹنگز دیکھ چکے ہو۔ تو کیا ہوا؟ آج کل نیوڈ پینٹنگ بھی لوگوں کے اندر تجسس جگانے میں ناکام ہو چکی ہے۔ آج کل میں جیتی جاگتی نیوڈیٹی بیچتا ہوں۔ تم اسکے کتنے ملے خریدو گے؟ یاد رکھو' میری بیوی معاوضہ اچھا ملنے پر تھوڑی دیر کے لئے کسی کی بھی بیوی بن سکتی ہے بلکہ اکثر تو معاوضے کا ذکر بعد میں آتا ہے۔ اس کیٹاگری کے لوگ میرے بہت قریب کے لوگ ہیں۔"

یہ آواز ایک فٹ پاتھ سے خریدی گئی ڈسکو شرٹ اور ناقص زپ والی پتلون کے مالک کے پاس سے ہی آسکتی تھی۔ مگر یہ حقیقت تھی کہ یہ آدمی اور کوئی نہیں' وہ خود تھا جسے میں نے چرچ روڈ پر نیوڈ پینٹنگ بیچتے دیکھا تھا اور ایسی ہی ایک پینٹنگ میرے پاس بھی تھی اور اس پینٹنگ کو دیکھنے کے بعد میں اسکے ماڈل کو دیکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

"تمہارے پاس اسوقت کل کتنے پیسے ہیں؟"

"سات روپے یا ایسا ہی کچھ۔"

"بہت کم ہیں۔" اس نے مایوسی سے گردن ہلائی۔ "اتنی تھوڑی سی رقم سے صرف بیماریاں ہی خریدی جا سکتی ہیں۔ ایک سگریٹ دو۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ایک کیٹاگری میرے اپنے لوگوں کی بھی ہے' ان کی جو مجھ سے بہت ہی قریب ہیں۔ اگر تم اس رقم سے محروم ہونا گوارا کر سکتے ہو تو تم بھی اس کیٹاگری میں آ سکتے ہو۔"

میں نے رقم نکال کر اسکی ہتھیلی پر رکھ دی۔

۲

ایسا نہیں کہ اس عورت کو میں نے پہلی بار دیکھا ہو۔ مگر جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا تو وہ کانونٹ سے بھاگی ہوئی تھی اور عادل کے ساتھ عیسائیوں کے محلے میں ایک کرائے کے مکان میں رہتی تھی۔ انکا پہلا بچہ تلف ہو چکا تھا اور عادل جیل میں تھا۔ یہ کتنا عرصہ قبل کا واقعہ ہے؟ مجھے تو یاد نہیں۔ مگر جب یہ حقیقت ہے تو زمان و مکان کی حدود میں کہیں نہ کہیں وقوع پذیر ہو ہی چکی ہوگی۔

کمرا کشادہ تھا۔ تین بہت ہی اونچی اور بند کھڑکیاں جن پر دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ دیوار سے لگی چند پرانی قدیم طرز کی کرسیاں جن میں سے دو پر ہم دونوں بیٹھے تھے۔ ایک طاقتور بلب جو کسی بھی شے کو عریاں کر سکتا تھا۔ اور سامنے کی دیوار پر چسپاں ننگے مرد اور عورتوں کی تصویروں کے تراشے۔ ان میں جیولز، صوفیہ لارین، بلیو فلموں کے چند گمنام کردار اور عادل کی اپنی بنائی ہوئی نیم عریاں تصویریں جو اسکی بیوی کی تھیں۔

"بعض لوگ تو اس کمرے میں داخل ہوتے ہی کانپنا شروع کر دیتے ہیں۔" عادل نے میری طرف

تاکتے ہوئے کہا۔ "جیسے کپڑا روزی کو نہیں، خود انہیں اتارنا ہے۔"

وہ کونے کی طرف چلا گیا جہاں ایک ایزل کھڑا تھا اور اس پر کینوس پھیلانے لگا۔ ٹیوب دبا کر پلیٹ پر رنگ ملاتے وقت وہ اپنے آپ میں اس درجہ ڈوب گیا کہ میں خود کو تنہا محسوس کرنے لگا اور سامنے کی دیوار پر نظر دوڑانے لگا جہاں روزی کی بہت ساری نامکمل تصویریں "ٹنگی تھیں ـــــ معمول کے مطابق عریاں۔ اچانک عادل نے کینوس پر فلڈ لائٹ روشن کردی۔

"گڈ گاڈ" میں نے بے چینی سے کہا۔ "یہاں پر تو میرا دم گھٹ جائے گا۔"

"نہیں" عادل نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "یہ بات ہوتی تو میں اور روزی کب کے دم گھٹ کر مر چکے ہوتے۔ اچھا میں روزی کو بلاتا ہوں۔"

اس نے دیوار سے لگے سوئچ بورڈ کا ایک بٹن دبا دیا۔ اندر بیل کی آواز سنائی دی اور روزی کسی روبوٹ ROBOT کی طرح دروازے پر نمودار ہو گئی۔ جیسے کالنگ بیل سے اس کا براہِ راست تعلق ہو۔ اپنی موجودہ مصروفیات کے باوجود نہ جانے کیسے اس نے اپنے جسم کو میلے سے بچا رکھا تھا۔ اس نے اسکرٹ اور بلاؤز پہن رکھے تھے، مگر اسکے چہرے پر میک اپ نہ تھا۔ وہ ایزل کے سامنے ایک اسٹول پر بیٹھ گئی۔ اور میری طرف تاکنے لگی۔ (مگر کیا وہ میری طرف تاک رہی تھی؟)

ایک ایک کر کے کپڑے اسکے جسم سے الگ ہوتے گئے اور سامنے کی تپائی پر جمع ہونے لگے۔ اب اس کے جسم پر لباس کے نام پر صرف انڈرویئر رہ گئے تھے۔

کینوس پر عادل کا برش چلنے لگا۔ بظاہر وہ ماڈلنگ کر رہی تھی، مگر اس کے بیٹھنے کا انداز اس بات کا نقیب تھا کہ اسے یہاں نیم برہنہ ہو کر بیٹھنے کا مقصد معلوم تھا۔ کپڑوں کے اوپر سے عورتیں کتنی کم عمر کی لگتی ہیں، مگر کپڑوں کے اترتے ہی ان کی عمر میں کتنی تیزی سے اضافہ ہوتا ہے۔ مگر میں تو صرف اسکی ناف کے متصل کے علاقے کو تاک رہا تھا جو غیر فطری طور پر ابھر آیا تھا۔ میرا اندازہ صحیح نکلا، وہ حاملہ ہو رہی تھی، ریزر کے تجربوں سے گذرے ہوئے اسکے بالائی ہونٹ پر ایک سرد، انتقامی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

عادل نے پینٹنگ کا سامان میز پر ڈال دیا اور فلڈ لائٹ بجھادی۔

"اب تم جاؤ" اس نے روزی کی طرف دیکھے بغیر ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

روزی پشت ہم دونوں کی طرف پھیر کر کپڑے پہننے لگی۔ اس کے جانے کے بعد عادل نے مجھ سے

کہا۔"

"تم چاہو تو اندر جا سکتے ہو۔ اس "مقدس" کام کے لئے ایک دوسرا کمرا مخصوص ہے۔"

"نہیں" میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ جانے کیوں میرے اندر اچانک اسکے لئے ہمدردی کا جذبہ جاگ اٹھا تھا۔ میں جانتا تھا اس طرح جو رقم اسے حاصل ہوتی تھی، وہ کسی نوبل کاز پر صرف نہیں ہوتی تھی۔ میں نے بارہا عجیب و غریب لوگوں کو اسکے گرد منڈلاتے دیکھا تھا اور اکثر ایسا ہوتا کہ وہ ہفتوں تک ہپیوں کے کسی گروہ کے ساتھ ہمالیہ کی ترائیوں کو ناپتا رہتا۔ "اب میں چلوں گا" میں نے اسکے چہرے پر اپنی نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔ "لیکن تھوڑی دور میرا ساتھ تو ضرور دو گے۔ اور کچھ نہیں تو اوپر پل تک ہی۔"

"تو سچ مچ تمہارا دم اس کمرے میں گھٹ رہا ہے" عادل مسکرایا۔ "اگر روزی یہ سنے گی تو اسے دکھ ہوگا۔ میں نے یہاں پر ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو اپنے کپڑے خراب کر ڈالتے ہیں۔ یہ اچھی بات نہیں۔ میں تمہیں کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کا مشورہ دونگا۔"

دھواں اگلتی چمنیاں، زنگ خوردہ فنیس اور جنگلے، بھوری و سیاہ دیواریں، چوکور شیشوں یا سلاخوں والی کھڑکیاں ــــــ کوئی بھی چیز نظر نہیں آرہی تھی۔ شام اتنی تاریک تھی کہ ہم آس پاس بیٹھے ہونے کے باوجود خود کو تنہا سے پا رہے تھے۔ نیچے جہاں تک نظر کام کر رہی تھی پٹریاں روشن بکھیروں کی مانند رات کے سینے میں پیوست تھیں۔ کھمبوں اور تاروں سے بلب جھول رہے تھے۔ روشنیوں کی تعداد میں جتنا اضافہ ہو رہا تھا۔ رات اتنی ہی سیاہ پڑتی جا رہی تھی، دل اتنا ہی بوجھل ہوتا جا رہا تھا ہم ایک دوسرے کے اتنے ہی قریب آتے جا رہے تھے یکایک میں نے سر اٹھا کر ریلنگ سے نیچے تاکتے ہوئے کہا۔

"اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ مجھے تمہاری بیوی کی عریانیت سے دلچسپی ہے تو تم غلط سمجھ رہے ہو۔"

"مجھے معلوم ہے۔" اندھیرے سے آواز آئی۔

"میں تم سے یہ نہیں کہونگا کہ تم یہ اچھا کام نہیں کر رہے ہو، کہ ایک عورت کو اس کا حق ہے کہ وہ کسی کے ہاتھوں کھلونا بنتا چھوڑ دے۔"

"مجھے خوشی ہے کہ تم اپنی حد سے واقف ہو۔"

"اگر کل تم باپ بن گئے تو اپنے بچے کو کیا جواب دو گے؟ فرض کرو کہ تمہارا بچہ یہ جاننا چاہے؟"

"میرا بچہ؟ کیا یہ ضروری ہے؟"

"میں نہیں جانتا۔"

"مگر تم کو اتنی تھوڑی سی رقم کے عوض اتنا کچھ کہنے کا حق کس نے سونپ دیا؟"

"تمہاری بیوی نے کیونکہ وہ حاملہ ہے۔"

"ارے نہیں۔" وہ اچھل کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھ جاؤ۔" میں بولا۔ "اس طرح کے پیشے کا ایک سب سے بڑا نقصان یہ بھی ہے کہ ایک باپ خود بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اسکے بچے کا باپ کون ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ یا پھر تم مجھے خوفزدہ کرنا چاہتے ہو۔"

"مجھے تم سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مگر اسکا یہ مطلب نہیں کہ میں تمہارے حالات سے بے خبر ہوں۔ تم نے اپنی خطرناک آئیڈیالوجی کی ایک بہت بھاری قیمت چکائی ہے۔ تم SEX-INHIBITIONS سے آزاد جس سوسائٹی کا خواب دیکھ رہے ہو وہ آج بھی تم سے بہت دور ہے۔ مگر تم ایک ٹوٹی ہوئی کشتی کی طرح طوفان کی زد میں بہتے چلے جا رہے ہو اور تم جہاں جا رہے ہو وہاں سے تمہاری واپسی ناممکن ہے۔"

کاش وہاں اندھیرا کچھ اور گہرا ہوتا۔ کاش میں اسکی موجودگی سے واقف نہ ہو پاتا۔ مگر جب دل میں درد کا لاوا ابل رہا ہو تو اپنا ہمزاد ایک ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ معاً مجھے اپنی گردن پر اسکی نکوٹین اور رپینٹ سے مہکی ہوئی سخت گیر انگلیوں کی گرفت کا احساس ہوا۔

"تم سچ کہہ رہے ہو نا؟"

"یہ بات تم اپنی بیوی سے جان سکتے ہو۔ مگر کیا تم نے اپنی بیوی کے اندر اپنی بیوی کو رہنے دیا ہے؟"

"میں روزی کا گنہ گار ہوں۔" اسکی چیخ تاریکی میں گھٹ کر رہ گئی۔ "اس نے اپنے بہت سارے بچے میرے لئے تلف کئے ہیں۔ وہ صرف مجھے چاہتی ہے اور ہر وہ چیز جسے میں چاہتا ہوں۔ لیکن کیا مجھے یہ حق پہنچتا ہے کہ اپنی منحوس شخصیت کا مہر کسی ننھی منی سی ہستی پر ثبت کر دوں۔؟"

اسکی انگلیاں میری گردن سے الگ ہو گئیں۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسکے جسم کو محسوس کرنا چاہا یکایک میں اچھل پڑا۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ "عادل!" میں سامنے کی طرف بھاگا جہاں اسکا ہیولا اندھیرے

میں تیر رہا تھا۔ میں نے جھپٹ کر اسے اپنی باہوں کے حصار میں لینا چاہا۔ مگر میرے داہنے ہاتھ میں صرف ایک ملائم سی چیز آ کر رہ گئی۔ اسکا جسم پل سے نیچے جا چکا تھا۔

نیچے پٹریوں کے درمیان دھواں ابل رہا تھا۔ دور ایک برقی ٹرین کی ہیڈ لائٹ روشن تھی۔ اسٹیشن کے جنوبی سرے پر مندر میں بھگت منڈل شور مچا رہے تھے۔ ایک کتا اندھیرے میں میری موجودگی کے اسرار تک پہنچنے کے لئے میرے قریب آ کر میری پتلون کو سونگھنے لگا۔

"مگر میری ایک شرط ہے کہ میں اگر بچ گیا تو تم اپنی راہ چل دو گے۔ تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے کہ میرے مڑے تڑے جسم پر کیا گذری۔"

میں نے مڑ کر کتے کی پسلیوں پر ایک ٹھوکر عائد کی اور نیچے کی طرف چل پڑا۔

۴

دروازہ اندر سے بند تھا۔ باہر گلی میں گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے دستک دینا مناسب نہ سمجھا کیونکہ مجھے اندر بیٹھک میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک آدمی رومال سے اپنا پسینے میں ڈوبا ہوا چہرا پونچھتا ہوا باہر آیا۔ اس نے شاید مجھے نہیں دیکھا تھا۔ یا دیکھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ میں پردا اٹھا کر گھپ تاریکی سے تیز روشنی میں داخل ہو گیا۔

روزی نے سر موڑ کر میری طرف دیکھا۔ وہ ایزل کے سامنے برہنہ کھڑی خلاؤں میں گھور رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اسکا جسم کانپ اٹھا۔ اور وہ اندر غائب ہو گئی۔ پھر نظر آئی تو اس نے ایک چادر اپنے جسم کے گرد لپیٹ رکھی تھی۔

"میں عادل کے لئے آیا ہوں۔" میں بولا۔

"اور عادل؟" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "میں کپڑے بدل لوں۔"

"نہیں۔ جو کچھ میں تم سے کہنا چاہتا ہوں، اس کے لئے کپڑے بدلنا ضروری نہیں۔"

"تو تم اپنے کپڑے اتار دو۔ میں عادل کو سنبھالوں گی۔"

"فرض کر لو میں اپنے کپڑے اتار دیتا ہوں۔ مگر اس سے عادل واپس آنے سے رہا کیونکہ اسنے پل سے نیچے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی ہے۔"

اسکے چہرے میں، اسکی آنکھوں کی پتلیوں میں اور اس کے کھڑے ہونے کے انداز میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ مگر اس کے داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے چادر کا سرا چھوٹ گیا اور اب اسکی انگلیاں پیٹ کے ابھرے ہوئے حصے پر مکڑی کی ٹانگوں کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ میں نے اس کی آنکھوں کے گرد پڑے ہوئے حلقوں کو دیکھا، اسکے پستان کو دیکھا جو پسلیوں سے چپکے ہوئے تھے۔ دھیرے دھیرے اسکی انگلیاں پھسلتی ہوئی اور بھی نیچے چلی گیئں۔ میں نے اسکی انگلیوں کی ملائمیت کو اپنی انگلیوں میں داخل ہوتے محسوس کیا اور سر جھکا کر دیکھا۔ عادل کی اونی ٹوپی میرے ہاتھ میں تھی، مڑی تڑی سی۔ جیسے عادل کے ساتھ ساتھ اس نے بھی خودکشی کر لی ہو۔

میں نے ٹوپی کھول کر اندر دیکھا، جھاڑ کر اسکی دھول کی مقدار میں کمی کی اور اسے واپس میز پر پینٹنگ کے دوسرے سامانوں کے درمیان رکھ دیا۔

"میں عادل کی جگہ تو نہیں لے سکتا۔" میں نے کہا۔ "مگر میں نے سوچا اس نے اپنی خودکشی کے ذریعے جو پیغام دینا چاہا ہے اسے تم تک پہنچا دوں۔"

"میں بہت دکھی ہوں۔" پہلی بار اس کے ہونٹ تھرتھرائے۔

"جو کچھ میں تم سے کہنا چاہتا ہوں ممکن ہے یہ تمہارے درد میں کمی کر دے۔" میں بولا۔

"عادل نے یہ خودکشی اس لئے نہیں کی ہے کہ تم اپنا حمل گراؤ۔ اب تک تم اپنا جسم اپنے شوہر کے لئے بچتی آئی تھی جو تاریک علامتوں کے پیچھے بھاگتے رہنے کا عادی تھا۔ اب اس جسم کو تمہیں اپنے بچے کے لئے بچا کر رکھنا ہوگا جو اس روشن سیارے کا بیٹا ہوگا جس میں عادل جیسے مفرور نہ بستے ہوں۔"

جب میں کمرے سے باہر جا رہا تھا تو کمرا سسک رہا تھا۔ میرا مسیح مر چکا تھا۔ میرا خدا دم توڑ چکا تھا۔ اور میں تاریک گلی سے اوپر پل کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہا تھا آخر کب تک اس دنیا پر عادل جیسے نیم پاگل انسانوں کی حکمرانی رہے گی؟ کب تک شیو سارا زہر خود ہی نوش کرتا رہے گا؟

یہ پندرہ برس پہلے کا واقعہ ہے۔

اب بھی اس پل سے گذرتے وقت میں خود سے یہی سوال کرتا ہوں۔

یہ خطرناک پل!!

گھاس، مسکراہٹ اور پھول دان

ایسا ایک بار نہیں، کئی بار ہوا ہے کہ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا ہے اور اسے اندر بیٹھا پایا ہے۔ عام طور پر کھڑکی کھلی رہتی ہے۔ جس کے قریب بیٹھا وہ بھاپ اور دھوؤں سے دھندلائے ہوئے شہر کی طرف تاکتا رہتا ہے اور جب باہر نہیں تاکتا تو چاقو سے لکڑی کے نرم تختے پر کوئی دیومالائی چہرا ابھارتا نظر آتا ہے۔ اسکی بھویں تخلیقی کاوش کے سبب سکڑی، بھری ہوتی ہیں، لیکن وہ بیئر کا گلاس اٹھانا نہیں بھولتا۔ وہ دور دراز کی زمینوں سے لائے گئے تجربات اپنی معمولی سی حرکت — مثلاً اپنے ہونٹوں کی اینٹھن یا گھٹنوں کی بے خبر جنبش میں سمو کر بڑا مسرور نظر آتا ہے

"اچھا، تو یہ آپ ہیں؟" وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر مجھے بھول جانے سے پہلے پوچھتا ہے۔ "شہر کی کیا خبر ہے؟"

"سنا ہے تعمیر نو کا جذبہ نئے سرے سے لوگوں کے اندر پروان پا رہا ہے۔ میں نے یہاں سے قدیم اقدار کی بے شمار بلند عمارتوں کو گرتے دیکھا ہے۔ بلکہ ابھی اڑتی ہوئی دھول میرے نتھنوں سے بھی ٹکرائی ہے۔"

میں کاغذات کا پلندہ کوٹ کی جیب سے نکال کر میز پر ڈھیر کر دیتا ہوں اور ایک کرسی اسکے قریب کھینچ کر بیٹھ جاتا ہوں۔ وہ مشتبہ نظروں سے میرا جائزہ لے کر مسکراتا ہے، کیونکہ میں ہر دن کچھ نہ کچھ بدلتا رہتا ہوں۔ وہ دن جب پہلی بار میں اپنا چہرا دیکھنے کا اہل ہوا تھا۔ اب ماہ و سال کے اندھیروں میں جانے کہاں گم ہو چکا ہے۔ لہٰذا آج جو چہرا میرے پاس ہے میں اسی پر اکتفا کر کے اسکی طرف تاکتا ہوں۔

"تمہارا مطلب لوگوں کے اندر اس جذبے سے تو نہیں جس کی بنیاد پر وہ ایک دوسرے کو مختلف پیمانوں سے سمندر کی طرف دھکیلنے میں معروف ہیں؟" میں کہتا ہوں "ہاں، ہو تو کچھ ایسا ہی رہا ہے۔ مگر خوبصورت اور متاثر کن الفاظ کی بارش میں اسے پہچان لینا بہت مشکل ہو گیا ہے۔"

"خیر، اسے چھوڑو، یہ ہمیں بھی معلوم ہے کہ ہم جس زمین پر کھڑے ہیں، اسکے اندر کون سا لاوا پک رہا ہے لیکن مجھے اپنے قدموں کے نیچے کچھ ملائم گھاس کا بھی احساس ہے۔ اس لئے میں اپنے اندر اپنے آپ کو زندہ محسوس کرتے ہوئے شرمندہ نہیں ہوں۔"

تو آج کل وہ ریت میں اپنا سر چھپانا بھی سیکھ گیا ہے۔ مجھے اس پر بہت ترس آیا۔ کل تک وہ اپنے آپ سے کتنا اجنبی تھا اور اپنی خالی بوتلوں پر لوٹتا ہوا عظیم سماجی مسائل سے الگ تھلگ اپنی دنیا میں اپنی ۔۔۔ اپنی سانسوں کا پیچھا کرتا ہوا آج کی اپنی اس پورٹریٹ سے کتنا غیر مشابہہ دکھائی دیا تھا۔ لیکن کچھ لمحے، کچھ چھینٹے اکراہیے زخمی لمحے کھلی ہوئی کھڑکی سے در آئے تھے اور اپنے قلم تراش چاقو سے اس نے اپنی انگلی کو زخمی کر لیا تھا اور گویا اس نیند سے یکایک جاگ گیا تھا جو ہمیشہ سے اس کی تقدیر رہی تھی۔ شاید اسے انسان بننے کی بھاری غلطی کی پاداش میں سوچنے کی سزا دی گئی تھی۔ اور اب وہ سوچ رہا تھا اور اسکے تختوں پر دیومالائی شکلوں کی بجائے کچھ آڑی ترچھی لکیریں جمع ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

پھر وہ ہمیشہ کی طرح شہر کی خبروں میں دلچسپی لینا شروع کر دیتا ہے۔

"مقامی سنے کلب ان دنوں جس متوازی فلم فیسٹول کے اہتمام میں مصروف ہے کیا اس میں شامل ہونے والی فلمیں اپنی ماہئیت و ہیئت کے اعتبار سے افرو ایشیائی ہیں۔؟"

"ہمارے نوجوان ادیب آج کل کن ہواؤں کے ساتھ پرواز کر رہے ہیں؟ یا انھوں نے بھی اپنے پر سونے اور چاندی کی دکانوں میں گروی رکھنا شروع کر دئے ہیں؟"

"انتخاب کے عبوری دور میں جو سلوگن دیواروں سے چپکائے گئے تھے ان کے جھوٹ کے کتنے حصے ثابت ہو چکے ہیں؟ یا آج کل خفیہ معاہدوں کی غلیظ سڑاندھ کہاں تک پہنچنے لگی ہے؟"

"غلامی کے سیاہ دور سے نکلا ہوا نیا روشن سپنا کہاں تک سچ ثابت ہوا ہے؟ کیا اب بھی اونچی کھڑکیوں سے بہہ کر آنے والی صداؤں میں معاشی غیر استحکامی کی گونج باقی ہے؟"

وہ ایک ہی سانس میں اتنا کچھ جان لینا چاہتا ہے کہ فوراً تھک جاتا ہے اور پھر اس میں یہ سب کچھ جاننے کی خواہش بھی باقی نہیں رہتی اور وہ آنکھیں بند کر کے اپنا ذہن خالی چھوڑ دیتا ہے۔ وہ اندر ہی اندر تیرتا ہوا کہیں دور جا نکلتا ہے اور میں اسکے تختوں پر ٹپکتے ہوئے خون کے قطروں کو گن کر حیران رہ جاتا ہوں کیونکہ تختوں پر جتنے دیومالائی چہرے ہیں، اتنے ہی قطرے بھی جھلملا رہے ہیں۔

"یہ کس حد تک صحیح ہے کہ یہ اتفاق نہیں ہے...." میں اسکے کان میں سرگوشی کرتا ہوں اور وہ آنکھیں کھول کر تاکتا ہے۔ لیکن اب وہ بدل چکا ہے جیسے طلسم ٹوٹ چکا ہو۔" پھر بھی چونکہ یہ ایک حادثہ تھا کہ ہم نے کھڑکی بند کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔" لیکن ایسا کیوں نہیں ہے کہ تم نے جو شکلیں ابھاری ہیں وہ اب ہمیشہ کی طرح دیومالائی نہیں ہیں۔؟"

میں روایت کی کال کوٹھری سے باہر نکل آیا ہوں۔" وہ اداس لہجے میں کہتا ہے۔" میرے اندر جاگتا ہوا پانچ لاکھ سالہ پرانا انسان ایک لمبی چھلانگ لگا کر ایک نئے ممولے میں بدل چکا ہے۔ میں نے جو کچھ کھویا ہے اسکے مقابلے میں کچھ نہیں پایا ہے۔ لیکن میری تلاش جاری ہے اور میرا خیال ہے شفق میں اب بھی بہت سارا سونا باقی ہے۔ ایک ہلکی سی روشنی کے سہارے میں بہت دور جا سکتا ہوں اور ایک کمزور موج کا سہارا مجھے اس بحر بے کنار سے گذرنے کے لئے کافی ہے۔"

"تب تو کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں رہ گیا ہے۔" میں کہتا ہوں۔" میں یہ تو بتا نہیں سکتا اور کتنی دہائیوں تک یہ رکی ہوئی سانسیں یوں ہی منجمد رہیں گی۔" کیونکہ کچھ گرم آنچ، زندگی کی سلگتی حرارت میری جڑوں میں جاگ چکی ہیں۔ لیکن میں یہ ضرور جاننا چاہونگا کہ ہمارے ہاتھ کس طرف کو بڑھ رہے ہیں؟ کیا تم اس معاملے میں ہماری مدد کر سکتے ہو؟"

"یقیناً!" وہ خود اعتمادی سے مسکراتا ہے اور تابناک بھوؤں کے پیچھے سے اس کا جاندار چہرا ایکا یک اسپات کا ڈھالا ہوا نظر آتا ہے جس میں پٹھے دار بازوؤں کی جنھوں نے لوہے پگھلائے تھے، اور شکن آلود پیشانیوں کی، جنھوں نے خدوخال تجویز کئے تھے، یاد تازہ ہو اٹھتی ہے جیسے خالق کی ہتھیلیوں کی گرمی اسکی آنکھوں میں جاگ چکی ہو۔" مجھے کچھ سبز گھاس، ایک بچے کی معصوم مسکراہٹ اور کچھ چینی مٹی کے پھول دان چاہئیں، چاہے وہ ٹوٹے ہوئے ہوں۔ میں انھیں اپنے تختے میں جاوداں طور پر منتقل کر لوں گا اور پھر اسکے کنارے ٹھہر کر تمہیں اپنا جواب مل جائے گا۔"

یہ میں جانتا ہوں کہ وہ کبھی کبھی نیم پاگل ہو اٹھتا ہے۔ لیکن اسکے ذہن کے مناظر ہمیشہ میرے لئے سود مند ثابت ہوئے ہیں۔

تو ہم دونوں گلاس بدل کر ایک دوسرے کا جام صحت تجویز کرتے ہیں اور شراب کی گرمی سینے میں بہائے ہوئے میں اسے اندر چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل جاتا ہوں اور لفٹ سے نیچے اتر کر داخلے کی سیڑھیوں کے باہر میرے سامنے جو دنیا کھلتی ہے اس سے میں بالکل ہی ناواقف ہوتے ہوئے بھی دیری

کے ساتھ اسکا سامنا کرتا ہوں۔

مگر میری آنکھیں حیرت و استعجاب سے کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ کیا اوپر جانے سے پہلے میں اسی شہر کو چھوڑ کر گیا تھا؟ کیا خود میں بھی وہی تھا جو اوپر جانے سے پہلے تھا؟ اور کیا اس شہر سے میرا تعلق بھی وہی تھا جو اب میں محسوس کر رہا تھا۔ الفاظ کبھی کبھی کتنے بے بس ہو جاتے ہیں جب نئی اصطلاحات کے جال میں ذہن جاگتا ہے، کیونکہ شہر کی دیواریں یکایک فصیلوں کی طرح بلند ہو گئی تھیں، جن پر بڑے بڑے الفاظ رینگ رہے تھے۔ آسمان توے کی طرح گرم ہو کر پسیج گیا تھا اور دریا میں بہتا ہوا پانی یکایک مختلف ٹکڑوں میں منقسم ہو کر سلولائٹ کی طرح جامد ہو گیا تھا۔ گاڑیاں اپنے شور اور دھوؤں کے ساتھ گویا فضا میں کسی سلائڈ کی طرح ساکت ہو گئی تھیں۔ دور، دور تک نہ پیڑوں کے سائے تھے، نہ غباروں کی رنگینیاں، زیبرا کراسنگ سے گذرتے ہوئے اسکول کے بچے پتھر کے تھے، ہوٹلوں کے باہر لہراتے ہوئے قومی ترنگے سب ایک رنگ کے تھے۔ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر تجریدی اسکول کے شاہکار کوڑی کے بھاؤ بیچتا ہوا بوڑھا سوداگر اپنا ہیٹ کان تک کھینچ کر مر چکا تھا اور صرف دور، آسمان کی انتہاؤں میں غائب ہوتے ہوئے لڑاکا جہازوں کے سلوٹس کے سوا کہیں پر کچھ نہ تھا جس سے زندگی کا اعلان ہو رہا ہو۔ اپنے وجود کی خطرناک حقیقت سے گھبرا کر میں نے کان زمین سے لگا کر سنا۔ زیر زمیں نالے شور مچاتے ہوئے بہہ رہے تھے اور دور کہیں پر فوجیوں کے بھاری بوٹ زمین پر اپنے نقشے ثبت کر رہے تھے۔

تو کیا چند لمحوں کی اڑان میں زندگی کا مفہوم اتنا بدل گیا تھا؟

کیا انسان اپنے زوال کے اتنا قریب تھا کہ وہ ہاتھ بڑھا کر اپنا بیئر کا گلاس تک نہیں اٹھا سکتا تھا؟

میرے اندر ایک اندھیرا دھواں کی طرح بھرنے لگا اور میں بھاگتا ہوا عمارت کے اندر سما گیا۔ میں تاریک زینوں کو عبور کرتا ہوا کمرے کے اندر طوفان کی طرح داخل ہوا تھا۔

میں نے کھڑکی سے آتی ہوئی ریڈیائی روشنی میں آنکھوں کو مل کر دیکھا۔

وہ اپنی سب سے نئی تخلیق پر مردہ پڑا تھا۔ اسکا ہاتھ جس سے وہ تختوں پر شکلیں ابھارا کرتا تھا، اسکے سینے میں پیوست تھا۔

اسکے تختے کے کنارے ٹھہر کر جس پر جما ہوا اسکا خون قطرہ قطرہ فرش پر ٹپک رہا تھا میں نے دیکھا تختے پر کوئی دیومالائی تصویر نہیں تھی، صرف ایک انسان کا جسم تھا جو اپنے خلیوں میں واپس لوٹ رہا تھا۔

مفرور

جوانی کی حدود میں قدم رکھتے ہی میرے اندر کا جنگل کافی گھنا ہو چکا تھا۔ سائے سے محروم جنگلی، کٹیلی جھاڑیوں کے درمیان مختلف حصوں میں بکھرا ہوا میں اپنے اندر کے جنگل کا قیدی تھا۔ لیکن یہ جنگل جو کہیں سے شروع نہیں ہوتا تھا اور کہیں پر جاکر ختم نہیں ہوتا تھا، دراصل جنگلی کٹیلی جھاڑیوں کے درمیان سائے سے محروم میرے وجود کا ہی ایک حصہ تھا۔ ایک مختصر سا راستہ جس پر چل کر کوئی کہیں نہیں جا سکتا، یا جس پر چل کر آدمی کہیں بھی جا سکتا ہے، اور جو صرف اس جنگل کے اندر ہی ممکن ہے یا اس جنگل کے بغیر بھی ممکن ہے، یا جس کے بغیر کہیں بھی جایا جا سکتا ہے یا بالکل جایا نہیں جا سکتا اور اصل یہ میرے وجود کی نامکمل کہانی ہے جہاں تمام عناصر دم توڑ دیتے ہیں اور وقت کسی رکے ہوئے سرخ برساتی نالے کے کنارے ٹھہر جاتا ہے اور میں اپنی نامکمل کہانی میں اس جنگل کی کٹیلی جھاڑیوں کے درمیان ایک سائے سے محروم راستے کے تعین کی فکر میں لگ جاتا ہوں۔ یہ جنگل جہاں دم توڑ دیتا ہے وہاں صرف جنگلی کٹیلی جھاڑیوں کے درمیان کالی دھوپ باقی رہ جاتی ہے اور گنجشک اپنی بے چین روح سے فضا میں اپنا ٹکڑا ٹکڑا گیت انڈیلنے لگتی ہے۔ جنہیں مکمل طور پر اور پوری دانشمندی کے ساتھ جوڑ کر بھی ایک گیت نہیں بنایا جا سکتا، نہ ہی ادھوری دانشمندی کے ساتھ اور نامکمل طور پر جوڑ کر یہ کام انجام پا سکتا ہے۔ نہ ہی گنجشک، اسکے باوجود کہ اس کی تعداد ہمیشہ اعداد و شمار کے اصولوں کے منافی ثابت ہوتی ہے، اس کسوٹی پر پوری اترنے میں دلچسپی کا اظہار کرتی ہے، نہ ہی اجتماعی طور پر نہ انفرادی طور پر اپنی اس خوبی کے باوجود جو اس کی خامی بھی ہے کہ یہ ہمیشہ کسی کنوارے جسم کی ناف سے نمودار ہوتی نظر آتی ہے اور اسکے چہرے کا دو تہائی حصہ کسی عمر رسیدہ عورت کی نیل کی طرح ہی سخت ہوتا ہے، گنجشک پھر

بھی ایک نامکمل چڑیا ہے جو گیت نہیں بنا سکتی یا اپنی کوششوں کو گیت میں نہیں ڈھال سکتی اور مجھے
بہ ہزار دقت اسے اپنی نظم سے نکال پھینکنا پڑتا ہے کہ کنجشک کسی نظم کی تشکیل میں معاون ثابت
نہیں ہوتی۔

"بیرا، ایک پیالی کافی!"

دراصل بیرا تک میں تھا اور اس کے بعد بیرا شروع ہوتا تھا اور بیرا جہاں ختم ہوتا تھا وہاں
پر کافی کی پیالی تھی اور خالی پیالی سے پرے نہ بیرا تھا نہ میں، صرف جنگل، جنگلی کیٹیلی جھاڑیاں، کنجشک اور
باہر سڑک پر ٹائروں کی چڑچڑاہٹ جو کبھی کبھی خون کے نشانات لئے ہوتے۔ تو میں کافی ختم کر کے اپنے
آپ کو اٹھا کر نیچے سڑک پر راہگیروں کے بہتے ہوئے ہجوم میں ڈال دونگا اور یہاں بیٹھا بیٹھا اپنے آپ کو
اس انسانی نہر میں بہتے ہوئے، تمام سمتوں سے آتے ہوئے اور تمام سمتوں کی طرف جاتے ہوئے دیکھتا رہونگا
میں اپنے جسم کے اعلان کو عمارتوں کی سنگین دیواروں سے ٹکرا کر چور چور ہوتے دیکھتا رہوں گا۔ نالوں کو
پھلانگتے وقت خود کو نالوں کا حصہ بنتے ہوئے دیکھوں گا اور ٹرام سے لٹک کر خود کو اسکے مخالف سمت جاتے
ہوئے دیکھوں گا۔ میں دیکھوں گا کہ میں ایک نل پر جا نکلا ہوں۔ جس سے عرصہ ہوا پانی آنا بند ہو چکا ہے اور
میں اس سے پیاس بجھا رہا ہوں۔ اور میں دیکھوں گا کہ میں ایک لڑکی کے جسم سے کپڑے اتار رہا ہوں اور
میں دیکھونگا کہ میں نے اس کی عصمت دری کر کے اسے نہر میں ڈال دیا ہے۔ جہاں پانی کی سطح پر بہتے بہتے
وہ مسکرا رہی ہے اور اپنے دونوں گھٹنوں کو ایک دوسرے سے خطرناک حد تک دور ہے جا رہی ہے یہاں
تک کہ ان کے درمیان سورج روشن ہو چکا ہے اور میں دیکھوں گا کہ پولیس کی وردی پہنا ہوا میں اپنے
پیچھے دوڑ رہا ہوں اور میں نے اپنے آپ کو گرفتار کر لیا ہے، اپنے آپ کو سشن جج کے سامنے لا کھڑا کیا
ہے جو کہ خود میں ہوں اور میں اپنے آپ کو سزائے موت دیتا ہوں اور میں دیکھتا ہوں کہ سزائے موت
دینے کے بعد میں نے اپنے ابروؤں کو عینک کے فریم سے اوپر چڑھا لیا ہے اور میں ایک دوسرے مجرم کی
طرف متوجہ ہو جاتا ہوں کہ وہ دوسرا مجرم بھی میں ہوں۔ اور دھیرے دھیرے میں اتنے سارے لوگوں میں
پھیل جاتا ہوں کہ مجھے اپنے آپ کو پہچاننے میں سخت دشواری ہونے لگتی ہے۔

تو کافی پینے کے بعد میں خود کو پیسے ادا کرتا ہوں اور سڑک پر اتر کر ایک ٹیکسی کو ہاتھ دے کر
روکتا ہوں جسے خود میں ڈرائیو کر رہا ہوں۔ میں پچھلی نشست میں دھنس جاتا ہوں اور میں ڈرائیونگ

سیٹ سے مڑ کر پیچھے تاکتا ہوں۔

"کہیں جانا ہے؟"

"نہیں تو" میں چونک کر اس سے کہتا ہوں، "کتنی غلط اطلاع ہے۔ لوگ آج کل کس قدر جھوٹ بولنے لگے ہیں بلکہ میں تو کہوں گا ہم اس جھوٹ کے مینار پر کسی گدھ کی طرح بیٹھے ہیں۔ تم نے گدھ دیکھا ہے۔ اگر نہیں دیکھا ہے تو بہت جلد لوگ تمہیں صلیب پر ٹھونک دیں گے۔ بلکہ میں تو مشورہ دوں گا کہ جلد سے جلد آئینہ دیکھ لو۔"

تو میں آنکھیں بند کر کے شہر کو چکر لگاتے دیکھ رہا ہوں۔ میں سڑک پر چل رہا ہوں۔ میں بالکنی سے جھانک رہا ہوں۔ میں شربت میں ممنوعہ رنگ ملا کر بیچ رہا ہوں اور میں ایک ٹرک کے نیچے آکر پس رہا ہوں اور ٹرک کا ڈرائیور کہ میں ہوں مجھے روندتا ہوا گزر رہا ہے اور میں کہ روندا گیا ہوں کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوتا ہوں اور سامنے چرچ کی طرف تاک کر اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتا ہوں کیونکہ مجھے خدا کی ذات پر یقین نہیں لیکن مجھے مسیح کا کراس پر کیل سے ٹھونکا جانا اچھا نہیں لگتا کہ یہ کیلیں در اصل میرے ہاتھوں اور پیروں میں ٹھونکی جاتی ہیں اور جب میں مرنے سے انکار کر دیتا ہوں تو یکایک میں خود کو مختلف ٹکڑوں میں منقسم پاتا ہوں جیسے پکاسو نے اپنے برش کی نوک سے سڑک پر ایک تصویر ابھاری ہو۔ (پکاسو! آہ، وہ اندھے جذبوں کا پیوندکار!) اور سڑک پر جو ٹرک کے پہیوں کے سرخ نشانات لیے ہوئے دور تک چلی گئی ہے، دوڑتے اس ٹرک کے اندر بیٹھا ہوا میں شمالی ہند کا ایک فحش گیت گا رہا ہوں، جس میں ایک شخص اپنی بھابھی کے ساتھ اپنے ناجائز تعلقات کا فخریہ اظہار کر رہا ہے اور بغل میں بیٹھے ہوئے کلینر سے کہ وہ بھی میں ہی ہوں، کہتا ہوں۔

"جنگل، ہمیں جنگل میں رکنا ہوگا۔ مجھے خون پہیوں سے دھونا ہوگا۔"

لیکن پہیوں کو دھوتے ہوئے یکایک مجھے اپنے خون سے ابکائی آنے لگتی ہے اور اپنی ابکائی روکتا ہوا میں اپنے کلینر کو کہ وہ بھی میں ہی ہوں، پہیے دھونے کا حکم دیتا ہوں۔ لیکن میں پہیے دھونے سے انکار کر دیتا ہوں کہ مجھے انسانی خون ناپسند ہے اور میں چیخ کر کہتا ہوں۔

"بہت جلد تم حوالات میں ہوگے اور میں گواہی دوں گا کہ تم نشے میں تھے اور تم اس وقت گا رہے تھے اور تم نے پہیوں کو دھونے کی کوشش کی اور کہ تم خدا کے وجود سے انکار کرتے ہو۔"

تو میں اپنے آپ کو اٹھاکر زمین پر پھینک دیتا ہوں اور چھری نکال کر اسکے حلق پر پھیر دیتا ہوں اور اسکے گرنے کی آواز سے سہم کر جنگل رونے لگتا ہے۔ مگر میں اس سے لاپرواہ کچھ دور کھڑا اپنے آپ کو دم توڑتے دیکھتا ہوں۔ میں پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اپنی طرف تاک رہا ہوں اور مرنے کے بعد بھی اپنی طرف اسی طرح تاکتا رہتا ہوں۔

لیکن مجھے اپنی موت سے دلچسپی نہیں، اور میں سیٹ کے نیچے سے رم کی ایک بوتل نکال کر شراب حلق سے نیچے ڈھکیلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر چاک نرخرے سے OLD MONK باہر آنے لگتی ہے اور میرے کپڑوں پر بہنے لگتی ہے۔

تو میں چیخ کر بوتل ونڈ اسکرین پر دے مارتا ہوں اور اسکے باوجود کہ اپنے پیچھے بلینک فائر کی آواز سنتا ہوں، مگر اس کی پرواہ کئے بغیر جنگل میں کود کر غائب ہو جاتا ہوں۔

اور اب میں سائے سے محروم جنگلی، کٹیلی جھاڑیوں میں مختلف حصوں میں بکھرا ہوا اپنے اندر کے جنگل کا قیدی ہوں۔ لیکن یہ جنگل جو کہیں سے شروع نہیں ہوتا اور کہیں پر جاکر ختم نہیں ہوتا، دراصل جنگلی کٹیلی جھاڑیوں کے درمیان سائے سے محروم میرے وجود کا ہی ایک حصّہ ہے۔

●●●●●

گلاب دین

وہ لنگڑا بہت دور سے چل کر آیا تھا اور اسپتال کے لان میں کھڑا تھا۔ پرانی گھسی ہوئی پتلون اور کوٹ کے اوپر اونی ٹوپی میں اس کا آدھا چہرا چھپ کر رہ گیا تھا۔ وہ بنگالی تو نہ تھا لیکن وہ جو زبان استعمال کر رہا تھا وہ دامودر کی گھاٹی میں رہنے والے ان لوگوں کی زبان بھی نہ تھی، جن کی مادری زبان کبھی ہندوستانی رہی ہوگی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ زندگی کی دوڑ میں وہ اتنی دور چلا گیا تھا کہ اسے بہت کچھ کھونا پڑا تھا جس کا اسے دلی رنج تھا۔

"یہ کچھ ایسا پیچیدا مسئلہ بھی نہیں صاحب۔" وہ اپنے ٹھگنے قد کے ساتھی سے اپنی عجیب وغریب زبان میں کہہ رہا تھا۔ یہ ٹھگنا ساتھی بھی لحاظ سے اس سے میل کھاتا نظر نہ آتا تھا۔ وہ ایک بنچ کے ہتھے پر بیٹھا ہوا تھا اور پسینہ میں ڈوبی ہوئی جرابوں کو ہوا میں سکھا رہا تھا۔ کچھ دنوں سے اسے بری طرح سے پسینہ آنے لگا تھا جس نے اسکے مزاج میں چڑچڑاپن ڈال دیا تھا۔ "تم اتنے متعجب کیوں ہو؟ میں بہت پرانا آدمی ہوں اور میں نے دنیا دیکھی ہے۔ وہ لوگ تمہیں کچھ دن رکھ کر موٹا تازہ کریں گے اور پھر چھری کانٹے لے کر تم پر ٹوٹ پڑیں گے۔ یہ تو ان کا روز کا معاملہ ہے۔ تم کیوں نہ لائن سے لگ جاؤ۔ دیکھو میں نے تمہارے نام سے ٹکٹ لے لیا ہے۔"

"کتنی بھیڑ ہے۔ یہاں تو میرا دم گھٹ جائے گا۔"

"ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔" بوڑھا خوش ہوتے ہوئے بولا۔ "جب ڈاکٹر تم سے کہیں گے، صاحب اس میز پر لیٹ جاؤ، تب پتہ چلے گا کہ صحت کی طرف سے لاپرواہی برتنے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔"

"بس بھی کرو نانا۔ ورنہ مجھے ڈاکٹر کی ضرورت نہ پڑے گی۔"

"میں تو چپ ہو جاؤنگا۔ لیکن تم ذرا ڈاکٹر کے پاس کھل کر بولنا۔" بوڑھا جیب سے تمباکو کی تھیلی نکالتے ہوئے بولا۔ "یاد رکھنا تم نے بولنے میں ذرا سی دیر کی کہ وہ وہی دوا لکھ دیں گے، جو وہ ہر دوسرے مریض کو دیتے ہیں چاہے اسکا مرض کچھ بھی ہو۔ ارے یہ ڈاکٹر لوگ اور بھلا ہوتے کس لئے ہیں؟"

ڈاکٹر اپنے چیمبر میں آچکا تھا اور قطار آگے کی طرف رینگنے لگی تھی۔ حاجب نے جلدی جلدی موزے اور جوتے پہنے اور لائن پر جا کھڑا ہوا۔ بوڑھا گلاب دین اس کے قریب منڈلاتا رہا اور اس نے آس پاس کے بہت سارے مریضوں سے جان پہچان بھی پیدا کرلی۔

"جب میری جورو زندہ تھی تو میں اسے برابر لے کر آتا تھا۔" اس نے مریضوں کو سناتے ہوئے کہا۔ "بڑی کڑاکے دار عورت تھی۔ ایسی کون سی بیماری ہوگی جو اسے نہ ہوئی ہوگی۔ ارے بھائی سب بڑھیا کا ذہنی فتور تھا۔ پھر بھی ڈاکٹر جو پنڈ چھڑانے کے لئے اسے دوا لکھ دیتے تھے تو اس وقت بڑھیا سے زیادہ خوش بھلا اور کون ہوگا۔"

"ذرا یہ تو بتاؤ نانا" اس نے تمہارے لئے کتنے بچے پیدا کئے؟" ایک مریض بولا۔

"بچے تو بہت سے جنے مگر بچے کہاں۔" بوڑھے نے ہنسنے کی کوشش کی۔ شاید وہ کمزور پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اپنی بے چینی پر قابو پانے کے لئے اس نے اونی ٹوپی کو سر سے اتار کر اپنی ابھری ہوئی رگوں والی انگلیوں کے گرد لپیٹ لیا۔ اس کے سر پر بڑھاپے کے سبب سنہرے ہو چکے بالوں کو دیکھ کر سب لوگ حیران رہ گئے۔

"تمہاری عمر کتنی ہوگی نانا؟"

"اب یہ تو حاجب ہی تمہیں بتا سکے گا۔" بوڑھا ہنسا۔ "وہ بالشت بھر کا تھا اور اپنی تعویز چبایا کرتا تھا جب ہم لوگ ملے۔ یاد ہے نا حاجب بیٹے؟ اس کا باپ کھیت میں دوسرے کھیت مزدوروں کے ساتھ حصہ دار تھا۔ آپس کی لڑائی میں مارا گیا بیچارا۔ فصل پکنے کے موسم میں ہمارے علاقے میں ایسا ہو جایا کرتا ہے۔ کسان اپنے کھیت کے لئے اپنا خون تک دینے سے گریز نہیں کرتے۔ ہم لوگ اتنے دنوں سے کسان رہے ہیں کہ اب تو مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ہمارے باپ دادا کا اور بھی کوئی پیشہ

رہا ہوگا۔"

تھوڑی دیر بعد جب حاجب ڈاکٹر کے چیمبر سے باہر آیا تو اس نے پریسکرپشن بوڑھے کو دکھا کر کہا۔

"جس بات کا ڈر تھا وہی ہوا۔ مجھے یہیں رہ جانا پڑے گا نانا۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ بار بار علاج سے بھاگتا رہا ہوں۔ اب کی بار داخلہ نہ لیا تو مرض لاعلاج ہو جائے گا۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ آپریشن جلد کر دے گا۔ مگر نانا! میں تو یہاں رہ جاؤں گا، تمہاری دیکھ بھال کون کرے گا؟"

"ارے فکر مت کرو۔" بوڑھے نے اس کا شانہ تھپتھپا کر کہا۔ "میں ٹھہرا لنگڑا۔ کسی نہ کسی طرح گھسٹ کر اپنی قبر تک پہنچ ہی جاؤں گا۔ مگر تمہیں تو ایک لمبی عمر جینا ہے۔ ابھی بھیانک بیماری اپنے اندر رکھ کر کیسے جیو گے؟ اور جیو گے تبھی تو میری دیکھ بھال کرو گے نا، کیوں؟ چلو ذرا دیکھیں، کون سا بستر ملا ہے تمہیں۔"

مگر اسے بستر نہیں دیا گیا تھا۔ اسے کاربورک اسٹڈ سے ملحق راہداری میں جگہ ملی تھی۔ راہداری میں اور بھی بہت سارے مریض لیٹے ہوئے تھے۔ کچھ قئے کر رہے تھے، کچھ کھانا کھا رہے تھے۔ ایک عورت جو غلطی سے زچگی کے شعبے کے بجائے راہداری میں جم گئی تھی اپنے ابھرے ہوئے پیٹ کے ساتھ وارڈ ماسٹر سے لڑ رہی تھی جو اسے وہاں سے نکالنے آیا تھا۔

"یہاں تو میں علاج کے باوجود مر جاؤں گا نانا۔" حاجب نے چہرا لٹکاتے ہوئے کہا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا بیٹے۔ آخر اتنے لوگ یہاں ہیں۔ ایک دو دن کے اندر اندر کوئی نہ کوئی بستر خالی ہو جائے گا۔" بوڑھے نے مریض کے لئے فرش پر کمبل بچھاتے ہوئے کہا۔ پھر خود اس پر بیٹھ کر اپنے لئے بیڑی بنانے لگا۔ کبھی کبھی وہ ترحم آمیز نظروں سے دوسرے مریضوں کی طرف بھی تاک لیتا۔ سورج کی روشنی گرل تک آ کر رک گئی تھی۔ راہداری سرد اور نیم تاریک ہو رہی تھی۔

بوڑھا ہر صبح اسپتال آتا اور دوپہر تک حاجب کے ساتھ رہتا۔ دھیرے دھیرے راہداری کے تمام مریض، اور بعد میں جب حاجب کو وارڈ کے اندر بستر دیا گیا، تو اس وارڈ کے مریض اسے پہچاننے لگے وہ مریضوں سے ان کی خیر و عافیت دریافت کرتا پھرتا۔ اپنے لنگڑے پیر کو گھسیٹتا ہوا ایک بستر سے دوسرے بستر، ایک مریض سے دوسرے مریض تک جاتا رہتا اور دنیا جہان کی باتیں کرتا رہتا۔ اس

ے منہ سے تجربات اس طرح باہر آتے کہ مریض اور ان کے رشتے دار دنگ رہ جاتے۔
"میں نے انگریزوں کو جھیلا ہے۔" وہ اپنے چہرے پر ٹھوری سے پرے زخم کے نشان پر انگلی
رکھ کر کہتا جو جھریوں کے جال میں کسی مکڑے کی طرح الجھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔
"تب وہ ہم لوگوں سے نیل کی کاشت کرواتے۔ ضرورت پڑتی تو ہنٹر بھی چلاتے۔ اور چلائیں
کیوں نا، جب ہم لوگوں نے اپنے سر خود ہی او کھلی میں ڈال رکھے تھے۔ اب تو میں خیر خوب بولتا ہوں، اکڑ
بھی لیتا ہوں، مگر اس وقت بڑا بزدل تھا بھائی، اب چھپانے سے کیا فائدہ۔ بہت سارے مزدور تو نیل
کے کھیتوں میں ہی مر جاتے تھے اور ان کے ہونٹ نیلے پڑ جاتے۔ ایک بار ایک انگریز کو کوبرے نے
کاٹ کھایا۔ ہم لوگ چپ چاپ کھڑے اسے مرتے دیکھتے رہے۔ کسی نے ڈاکٹر کو خبر نہیں کی۔ شاید کوشش
کرتے تو وہ بچ سکتا تھا۔ مگر ہمیں تو اپنا انتقام لینا تھا۔ تو اسکا جسم نیلا پڑ گیا، بالکل نیل کے کارخانے میں
ہنٹر کھانے والے مزدوروں کی طرح۔ اس وقت تو سوچ کر بڑا لطف آیا تھا۔ لیکن اب دل دکھتا ہے۔
بیچارا سات سمندر پار کر کے آیا تھا اور مرا کیسی موت!"
"کیوں نہ کسی فرضی بیماری کے بہانے تم بھی داخلہ لے لو گلاب دین؟ بڑا مزا رہے گا۔"
"کس لئے؟ بہت بولتا ہوں نا؟ تم سوچ رہے ہو گے کہ ہر وقت میں تم لوگوں کا دل بہلاتا
رہوں گا۔" بوڑھا احساس برتری کے جذبے سے شرابور ہو کر مسکرایا۔ "مگر کچھ دن جا لینے دو، تم مجھ سے
اکتا جاؤ گے، جیسا کہ حاجب اکتا گیا ہے۔ ذرا دیکھو اسے، کیسا آنکھیں بند کئے پڑا ہے۔ وہ میری بات نہیں
سن سکتا، مگر مجھے روکنے سے مجبور ہے۔ آخر میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے پالا ہے۔ تب جا کر تم لوگ
اسے یہاں دیکھ رہے ہو۔"
ایک دن وہ اسپتال پہنچا تو اسکے کوٹ کی دونوں جیبیں پھولی ہوئی تھیں۔ وہ گاؤں سے مٹھائی خرید کر
لایا تھا۔ وہ تمام مریضوں کو مٹھائی بانٹتا پھرا اور اس دوران اس نے بہت کم باتیں کیں۔
"کیوں گلاب دین، کوئی خوش خبری لائے ہو کیا؟" شمالی ہند کے ایک لمبے تڑنگے مریض نے
کہا۔ اسے دیکھ کر بالکل نہیں لگتا تھا کہ کوئی مرض اس پر حملہ بھی کر سکتا تھا۔
"کل میرے حاجب کا آپریشن ہونا ہے۔ تم لوگ خدا سے دعا مانگو کہ وہ حاجب کو اپنی رحمت
کے سائے میں لے۔" بوڑھے نے کوٹ کی آستین سے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ "میں رات بھر

سو نہ سکا۔ میرا دل بہت کمزور ہو گیا ہے بوڑھا ہو رہا ہوں نا۔ اب تو ایک ہی تمنا ہے کہ حاجب کو واپس کھیتوں میں کام کرتے دیکھوں۔ چاہے اس کے لئے مجھے اپنی قبر کے اندر سے کیوں نہ جھانکنا پڑے۔"

"یہ ہو جائے گا گلاب دین۔" اس مریض نے کہا جیسے وہی کل کائنات کا چلانے والا ہو۔ "میں اس سے بھی خطرناک آپریشن دیکھے ہیں۔ آج کل یہ کچھ بھی نہیں رہ گیا ہے، تم خود دیکھ لو گے۔"

"تمہارا شکریہ" "بہت بہت شکریہ۔" بوڑھے نے گرمجوشی سے مریض کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ اور فرط مسرت سے اسکے آنسو نکل آئے۔ "تم اچھے ہو جاؤ تو ہمارے گاؤں آنا۔ تھوڑے بہت سے گھر ہیں مگر کافی لوگ رہتے ہیں وہاں پتھروں کی زندگی ہے بھائی، ہم اور کوئی زندگی جانتے بھی نہیں۔"

جس صبح حاجب کا آپریشن ہونا تھا اس وارڈ میں ایک موت ہو گئی۔ بوڑھا جب اسپتال پہنچا تو حاجب کو آپریشن تھیٹر لے جایا گیا جو دوسری عمارت کے فرسٹ فلور میں واقع تھا۔ بوڑھا آپریشن تھیٹر کے باہر لان میں بے چینی سے ٹہلتا رہا۔ اپنی بے صبری میں کبھی کبھی وہ لفٹ تک چلا جاتا اور ایک بار نیچے لان میں آکر وہ دھوپ میں لنگڑاتا ہوا پانی کی ٹنکی تک چلا گیا۔ جس کے نیچے بھکاری بیٹھے تھے۔ نل کے قریب پہنچ کر جب اسے محسوس ہوا کہ اسے زور کی پیاس لگی ہے تو اسے حیرت ہوئی۔ وہ اتنی دور اپنی پیاس بجھانے کے لئے ہرگز نہیں آیا تھا۔ پانی پئے بغیر وہ واپس لوٹ گیا۔

سورج سر پر چڑھ چکا تھا جب ڈاکٹر تولیہ سے ہاتھ پونچھتے ہوئے باہر آئے۔ آپریشن ناکامیاب رہا تھا۔ اس خبر نے پہلے تو بوڑھے کو ساکت کر دیا۔ پھر وہ بھد کتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ زینے کے آخری سرے پر کسی نے کندھے سے پکڑ کر اسے روک لیا۔

"کدھر جا رہے ہو؟"

"مجھے حاجب سے ملنا ہے۔ ذرا راستہ تو دو۔"

(۲)

دوپہر ہو رہی تھی اور وارڈ سنسان پڑا تھا۔ حاجب کے بستر پر ایک دوسرے مریض کا قبضہ ہو چکا تھا کیونکہ اس کے مرنے کی اطلاع وارڈ میں پہنچ چکی تھی دوسرا بستر بھی خالی ہونے جا رہا تھا کیونکہ اس کی لاش کو لے جانے کیلئے اسکے آدمی ٹیکسی کا انتظام کرنے گئے تھے۔ صرف لاش کے سرہانے ایک جوان عورت کھڑی اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"بیچارا گلاب دین، اس واقعے نے اسے توڑ کر رکھ دیا ہوگا۔" دو مریض آپس میں سرگوشی کر رہے تھے۔

"اس طرح کے بوڑھے اب نہیں پائے جاتے۔ اس سے تم بلا جھجک اپنے دل کی بات کہہ سکتے تھے۔ کچھ روز تک یہ وارڈ بڑا سونا سونا سا لگے گا۔"

تمام مریضوں کو بڑی حیرت ہوئی جب انھوں نے گلاب دین کو وارڈ کے اندر آتے دیکھا، گرچہ اس کے چہرے کے نقوش ڈھیلے پڑ گئے تھے مگر اس نے اپنے آنسو پوچھ ڈالے تھے۔

"میں پہلے نہ آسکا،" بوڑھا غمزدہ عورت کے پاس پہنچ کر بولا۔ "مجھے حاجب کی لاش کو لے جانے کے لئے گاڑی ٹھیک کرنی تھی۔"

عورت خالی خالی آنکھوں سے اس کی طرف تاکنے لگی۔

"تمہارا شوہر مر گیا، مگر تمہیں دو بچے دے گیا ہے،" بوڑھا خلا میں گھورتے ہوئے کہتا رہا۔ "رو لو اگر اس سے دل ہلکا ہوتا ہے۔ میں جھوٹ نہیں کہوں گا، میں ابھی ابھی رو کر آرہا ہوں۔ اگر اس قدر پرانا ناطہ توڑنا اتنا آسان ہوتا تو کیا بات تھی اور پھر میرے علاوہ اس کا تھا بھی کون؟ بڑھیا نے مرتے وقت مجھ سے کہا تھا۔ "یاد رکھنا میں مرتے سمے تم سے کہہ رہی ہوں، حاجب تمہارے ورثے ہے۔ دوسرے کا بچہ سمجھ کر ٹال نہ جانا ورنہ میں قیامت میں تمہارا دامن پکڑوں گی۔" اب میں اسے کیا منہ دکھاؤں گا۔ کیسا بدھا کھوٹ نکلا ہیں کہ خود تو جیتا رہا اور اسے چلتا کر دیا۔ یہاں کے ڈاکٹر بھروسے کے قابل نہیں۔ لیکن میں انہیں دوش نہ دوں گا۔ جو زندگی نہیں دے سکتے وہ بھلا موت کیا دیں گے۔ اصل میں اوپر سے ڈوری کھینچ لی گئی، ہم لوگ خواہ مخواہ ایک دوسرے پر الزام تھوپتے ہیں۔"

وہ باری باری سے تمام مریضوں سے ملنے آیا۔

"حاجب کے سبب تم لوگ مجھے بہت دنوں تک یاد آؤ گے۔" اس نے کہا۔ "میں بوڑھا ہو گیا ہوں نا اس لئے بہت بولتا ہوں۔ لیکن اب حاجب کے بغیر بولنے کا مزا بھی جاتا رہا۔ تمہیں یاد ہے وہ کیسا آنکھیں بند کئے پڑا رہتا تھا؟ سب بناوٹ تھی۔ دراصل وہ پوری ہوشیاری سے مجھے سنتا تھا۔ مگر مجھ سے ڈرتا تھا۔ میں نے اسی طرح اس کی پرورش کی تھی کہ وہ ڈرے۔ پرانے وقتوں میں لوگ ایسا ہی کرتے تھے۔ غلط طریقہ تو ہے مگر کیا کیا جا سکتا ہے۔ اب تو وہ بھی نہیں رہا۔ اچھا، خدا حافظ۔"

اس نے جاتے جاتے عورت کو آخری بار رلا سا دیا۔ مریض کھڑکیوں سے، دروازوں سے اور فینائل اور کاربولک ایسڈ سے مہکتی ہوئی راہداری سے اسے تاکتے رہے۔ لان میں اتر کر وہ لنگڑاتا ہوا پھاٹک کی طرف بڑھ گیا۔ ڈھلتی دھوپ اور پتوں کے جھلملاتے ہوئے سائے میں اس کا جھکا ہوا جسم کسی ٹوٹے ہوئے قلم کی طرح آگے کی طرف گھسٹتا جا رہا تھا جیسے وہ اپنی شامِ حیات کا آخری صفحہ قلمبند کر رہا ہو۔

"لگتا ہے بوڑھا اب کچھ ہی دن کا مہمان ہے۔" ادھیڑ عمر کے مریض نے کھڑکی سے سر موڑ کر اپنے پڑوسی سے کہا اور جھک کر کھانسنے لگا۔

●●●●
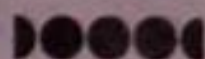
نفرت کا حق

ہر روز بارہ اور ایک بجے کے درمیان اس لڑکے کی پولیو کی ماری ہوئی پتلی پتلی ٹانگیں آفس روم کے دروازے پر آ کھڑی ہوتی تھیں۔

ٹائپ کرتے کرتے یا قلم چلاتے چلاتے میری انگلیاں رک جاتیں اور میں سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگتا۔"

پتلی گردن پر جما ہوا ایک پتلا سا بے ڈھنگا سر ابھری ہوئی پیشانی کے نیچے حلقوں میں ڈوبی ہوئی دو بے نور آنکھیں، کمر کی ہڈیوں الجھا ہوا ڈھیلا نیکر، اس کے اوپر پسلیوں کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی ایک بوسیدہ قمیض اور ان تمام چیزوں سے ہم آہنگ ایک ویران اور سہمی ہوئی آواز

"خدا کے لئے! میں پیاسا ہوں!"

مجھے اس سے نفرت تھی۔ اس کی آواز سے ایک ایسی خود اعتمادی کا اظہار ہوتا تھا جیسے اسے اپنی مفلسی کے باعث کسی بھی انسان کے سامنے اپنا ہاتھ پھیلانے کا ایک فطری حق حاصل تھا۔ چپراسی مگ سے اسکے لئے پانی انڈیلتا، اکاؤنٹنٹ اپنی کنجوس جیبوں میں کوئی کمزور سکہ ٹٹولتا لیکن میرے دل میں ہمدردی کا کوئی جذبہ نہ جاگتا۔ میرا خیال تھا کہ کسی بھی انسان پر اس طرح سے اثر انداز ہونے کا اسے کوئی حق نہیں، کیوں وہ اپنا منحوس وجود ہر روز میری آنکھوں کے سامنے کھینچ لاتا ہے۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کھلتے ہوئے پھولوں کی روشنی، میں سننا چاہتا تھا گنگناتے آبشاروں کا ترنم، میں سمجھنا چاہتا تھا کنوارے ہونٹوں کی میٹھی مسکراہٹ، مگر کیوں ہر بار، ہر موڑ پر اس کی بے نور

آنکھیں میرے پھولوں سے روشنی چھین لیتی تھیں، اس کی خشک آواز میرے آبشاروں کو گونگا بنا دیتی
تھی، اسکے الگ الگ دانتوں پر جلتے ہوئے خشک ہونٹ کنوارے لبوں کی مسکراہٹ کو حسرتناک
بے حسی میں تبدیل کر دیتے تھے ؟ کیوں ؟ میں جانتا تھا کہ سب اس سے نفرت کرتے ہیں اور اسے
پیسہ نکال کر صرف اس لئے دیتے ہیں کہ وہ ان کے سامنے سے جلد ہٹ جائے۔ دراصل لوگ اس کی انگلیوں
میں پیسہ نہیں تھماتے تھے، بلکہ اپنے خوف کے آگے سر جھکاتے تھے ـــ خوف جو انسانی روح کا خاصہ
ہے، جو مذہب کی بنیاد ہے اور جو اخلاق اور نیکی کا سرچشمہ ہے۔ لیکن میں اس خوف سے الگ تھا کم از کم
مجھے ایسا ہی محسوس ہوتا تھا۔ اس لئے میرے اندر اس کے لئے ہمدردی کا جذبہ نہیں جاگتا تھا اور اس لئے
میں اپنے آپ کو اس کے خانے میں رکھ کر نہیں دیکھتا تھا اور اس سے نفرت کرتا تھا۔ شدید نفرت۔ کیوں
وہ اس طرح میری طرف تاکتا تھا جیسے میں اسکا مجرم ہوں ؟ اس کا چہرا اس قدر بھدا اور مکار کیوں تھا ؟
ٹھیک ہے کہ اسکے چہرے کی بناوٹ ہی ایسی تھی، مگر جس طرح وہ اپنی اس بناوٹ سے نہیں بھاگ سکتا
تھا، میں بھی اپنی نفرت سے کیوں کر فرار حاصل کر سکتا تھا۔

"بابو!" چپراسی نے ایک دن ہیڈ کلرک سے کہا۔ "رائے بابو سے کہہ کر اسپتال میں اس کے
لئے دوادارو کا انتظام کر دیتے تو اچھا تھا۔"

جس سماج سیوک کا اس نے نام لیا تھا، میں اس سے واقف تھا۔ وہ ایک وکیل تھا۔ اور
ایک مکار سیاست داں۔

"شیطان ہے یہ تو۔" ہیڈ کلرک نے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔ "اسے صرف بھیک مانگ کر پیٹ
بھرنے سے مطلب ہے۔ کیوں بے، جائے گا تو اسپتال ؟ وہ لوگ تجھے کپڑا دیں گے، پیٹ بھر کر کھلائیں گے
اور تیرا علاج کریں گے۔"

"نہیں ـــ مجھے اسپتال سے ڈر لگتا ہے۔" اس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"تو ـــ" ہیڈ کلرک غصے سے پیپرویٹ کو اٹھاتے ہوئے بولا۔ "تیرے ماں باپ کہاں
رہتے ہیں ؟"

"میری صرف ماں ہے ـــ" پھر دھیرے دھیرے اس کا سایہ برآمدے سے ہٹ گیا۔ "خدا
کے لئے ـــ" اس کی آواز آخری بار راہداری میں سنائی دی جس کے بعد کی خاموشی کو عجیب پر در

اکاؤنٹنٹ نے توڑا۔

"حرامی ہے بیچارہ!"

کاش میں اسے وہاں آنے سے روک سکتا۔ کاش لوگ اس کی ہمت شکنی کرتے۔ مگر وہ ہر روز میری نگاہوں کے سامنے آجاتا۔ اسکے آتے ہی میں اپنے کام میں ڈوب جانا چاہتا۔ مگر فوراً مجھے محسوس ہوتا کہ میری اداکاری پر وہ مسکرا رہا ہے' ایک تلخ مسکراہٹ!

فروری کے آخر میں جانے کیوں یکایک اس نے آنا بند کر دیا۔ وجہ کچھ بھی ہو' میں نے چین کی سانس لی۔ مگر عجیب بات تھی کہ ٹھیک اس وقت جب وہ معمولاً آیا کرتا تھا ہم سب کی نگاہیں دروازے کی طرف اٹھنے لگتیں' اب مجھے احساس ہوا کہ نفرت کا رشتہ بھی انسان کو ایک دوسرے سے کتنا قریب کر دیتا ہے۔

سب نے یہ فرض کر لیا' اگر کسی نے اسکا اظہار نہیں کیا۔۔ کہ یا تو وہ شہر چھوڑ کر جا چکا ہے یا پھر کسی دوسری جگہ اسے لوگوں کی زیادہ گہری ہمدردی حاصل ہو گئی ہے۔

ایک دن آفس ختم ہونے کے بعد' قریب آتی ہوئی شام کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے میں سڑک پر چلا جا رہا تھا کہ یکایک گل مہر کے ایک پیڑ کے نیچے پہنچ کر جس کی شاخوں میں نو خیز پھولوں کے سبب شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ میرے قدم برف کی طرح منجمد ہو گئے۔

سامنے ہی سنگ میل سے کمر لگائے وہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں سامنے کی طرف پھیلی ہوئی تھیں اور اس کا چہرا پہلے کے مقابلے میں زیادہ مرجھایا ہوا اور اداس نظر آ رہا تھا۔ اسکی آنکھیں ایک لمبی بیماری کی چغلی کھا رہی تھیں۔ اسکی دونوں خشک ٹانگوں کے درمیان ایک کٹورا رکھا ہوا تھا جس میں وہ بھیک کے پیسے جمع کر رہا تھا۔ اس کے چہرے کی طرف تکتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ وہ پہلے سے کہیں زیادہ نفرت انگیز ہو گیا ہے۔

"خدا کے لئے!" مجھے دیکھتے ہی مشینی انداز سے اسکے اندر سے آواز آئی۔

میں نے اپنے قدم تیز کر دئے۔ اسکے قریب سے گذرتے ہوئے ایک پل کے لئے ہم دونوں کی نگاہیں ملیں اور وہ مجھے پہچان گیا۔ تھوڑی دور جا کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

وہ میری طرف ایک ٹک تاک رہا تھا۔ میں نے اپنے قدم تیز کر دئے۔

اس روز کے بعد وہ مجھے روز وہیں بیٹھا نظر آنے لگا۔ لیکن اب مجھے دیکھ کر وہ آواز بلند نہ کرتا۔ پھر ایک دن، جب میں آفس سے بہت دیر سے باہر نکلا تھا اور ہلکی تاریکی ہر طرف پھیل گئی تھی، میں نے ایک عورت کو اس جگہ سے اسے گود میں اٹھاتے دیکھا۔ شاید وہ عورت، جو وقت سے پہلے ہی جوانی بیچ چکی تھی، اس کی ماں تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گیا ہے۔ مجھے اس پر سخت غصہ آیا۔ کمبخت اسپتال سے ڈرتا تھا، جیسے وہ کوئی زہریلا کیڑا ہو۔ ٹھیک ہی تو ہے، وہ اس حشر کا مستحق ہے مگر اگلے ہی لمحے مجھے اپنے شہر کے اسپتال کا بھیانک ماحول یاد آگیا اور مجھے یہ بھی یاد آیا کہ بچپن میں ایک بار ایک فریکچر کے سلسلے میں جب مجھے اسپتال لے جایا گیا تھا تو میں کتنا خوفزدہ تھا۔

(۲)

آج صبح اس کے قریب سے گذرتے ہوئے میں نے اسے آنکھیں بند کئے ہوئے بیٹھے دیکھا آج اس نے اپنی ٹانگوں پر ایک بوسیدہ کمبل کا ٹکڑا لپیٹ رکھا تھا۔ میں اس کے بالکل قریب سے گذرا مگر اس نے میری طرف نہیں دیکھا۔ شاید وہ میرے قدموں کے چاپ سے مانوس ہو چکا تھا۔ اس وقت میں نے غور سے ایک دوسری ہی روشنی میں اس کے چہرے کا جائزہ لیا ——— نہیں، دراصل وہ اتنا بدصورت نہیں تھا جتنا نظر آرہا تھا۔ بھوک اور مفلسی نے اس کے گالوں کی شفق چوس لی تھی۔ اور اس کی آنکھوں کے ستاروں کو بجھا دیا تھا۔ یکایک مجھے اس کی اداسی اور بے وقت کی موت کے پیچھے جانور نما لوگوں کا ایک پورا ہجوم نظر آیا۔ وہ سب سکوں کے انبار پر کھڑے تھے اور لانبی لانبی سیرنج کے ذریعے لوگوں کے جسموں سے خون کھینچ رہے تھے۔ جو نیچے تپتے میدانوں میں پتھر کاٹ رہے تھے۔ جب کوئی شخص تمام خون نکل جانے کے بعد زمین پر گر پڑتا تو وہ سیرنج اسکے جسم سے الگ کر دیتے اور پھر اس کے سامنے بھیک کے ٹکڑے ڈالنے لگتے۔"

اپنے اندر ایک اذیت ناک جہنم چھپائے ہوئے میں آفس میں چپ چاپ اپنا کام کرتا رہا۔ آج ایک حقیر، بدصورت اور غلیظ ہستی کے سبب میرا تمام فلسفۂ حیات مکروہ ہوتا جارہا تھا۔ میرے اندر کمزوری کے آثار نظر آنے لگے تھے اور گویا دنیا میرے سامنے ایک نئی شکل اختیار کرتی جارہی تھی۔ جب میں آفس سے باہر آیا تو آسمان پر ایک ایسی چمک نظر آرہی تھی جسے ہر وہ انسان جس نے اپنی روح کا دروازہ ایک نئے شہر پر کھول دیا ہو، محسوس کر سکتا ہے۔

دھیرے دھیرے میرے قدم اس کے قریب جاکر تھم گئے۔

وہ سنگِ میل سے پیٹھ لگائے بیٹھا تھا اور اس کا سر ایک بوجھ کی طرح سینے پر لٹکا ہوا تھا۔ اسکے دونوں ہاتھ فٹ پاتھ پر گھرے ہوئے تھے اور اسکے بڑے بڑے بے ترتیب بال ہوا کے جھونکوں سے لرز رہے تھے۔

پہلے اس کی اس قابلِ رحم حالت کے پیچھے میں اس کی بیوقوفی کو کارفرما دیکھتا آیا تھا، مگر اب میں اسکے پس منظر میں ایک دوسری ہی روشنی دیکھ رہا تھا۔ مجبوری اور بے کسی کی اذیت ناک روشنی جس نے اسکے پورے وجود کو نفرت انگیز اور بدصورت بنا دیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا، جب تک اس دنیا میں ایک بھی شخص اس طرح کی غیر یقینی اور حقارت کی زندگی جی رہا ہے، نہ تو انسان اپنے آپ سے آزادی حاصل کر سکتا ہے، نہ خدا پرستش کے لائق ہے۔

ایک سکہ میری انگلی سے الگ ہو کر آنسو کی طرح اس کے کٹورے میں جا گرا۔

اس نے چونک کر سر اٹھا کر دیکھا۔ یکایک اس کی آنکھوں میں ایک تیز روشنی لہرائی اور اسکا جسم کانپنے لگا۔ اسکا مرجھایا ہوا ہاتھ کٹورے کی طرف بڑھا اور پتھریلے فرش پر ایک سکے کے گرنے کی آواز سنائی دی جو میرے پیروں تک آ کر ختم ہو گئی۔

میری آنکھیں اس کے ہونٹوں کو الگ الگ دانتوں پر مسکراہٹ کی شکل میں پھیلتے دیکھ رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں صاف کہہ رہی تھیں۔

"مجھے بھی نفرت کا حق ہے! مجھے بھی نفرت کا حق ہے!!"

●●●●

ایک پانچ پیسے

یاروں نے کہا کہ پی کر دل کا بوجھ ہلکا کیا جائے۔ سنہری عقاب! اُنہہ، کیا بچوں جیسی بات کرتے ہو۔ رم کا ذکر کرو۔ سب نے حامی بھری، ریڈ نائٹ زندہ باد! مگر پیسے؟ ہاہ۔ ہمیں اپنی خالی جیبوں کا احساس ہوا تو یکایک آسمان پر بکھرے ہوئے نیون سائن ہنس پڑے YOU PAUPER، جاؤ اور اپنی ناک فٹ پاتھ سے رگڑ دو۔ ممکن ہے تمہارے کولہوں پر جوتے پڑنے کے بجائے تمہاری ہتھیلیوں پر غلیظ نوٹ آ گریں۔

بندرگاہ میں اسٹرائک تھا اور ہم کیبلس اور ہنیڈ بیرونز کے درمیان الجھے ہوئے تھے۔ رمضان نے اپنی گیلی قمیض کو بدن سے پیاز کے چھلکے کی طرح الگ کرتے ہوئے کہا "میں ایرانی انقلاب کی داد دیتا ہوں اگرچہ اسے تسلیم نہیں کرتا۔ برنج کے لئے بچھے ہوئے تختوں کے درمیان لمحے کھلے لمحے دفن ہوتے چلے گئے۔ موم بتی پر پھونک مار کر ہم نے رات کے چہرے پر سیاہی پھیر دی۔ لیکن جس طرح نوک قلم سے کسی جملے کو کاٹ دینے پر بھی وہ اس بے رحم لکیر کے پیچھے سے دانت نکال کر ہنستا ہے، کلکتہ ہمیں نظر آتا رہا۔ اس نے ایک وحشی چہرا اوڑھ لیا تھا جیسے ابھی ابھی کسی عورت کے ساتھ بدفعلی کر کے اٹھا ہو۔"

"یار وہ لڑکی، کیا نام تھا اس کا؟"

"لڑکی کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ لڑکی لڑکی ہوتی ہے۔"

لیکن وہ لڑکی جس نے جلتے ہوئے آسمان کے نیچے اپنا ننگا سینہ کھول کر کہا تھا "دیکھو اور اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ گیتا سے بھی زیادہ مقدس اور قرآن سے بھی زیادہ عظیم ہے۔ ارے پاگل تھی یار! پاگل؟ ہونہہ، پاگل تو جوب چارنک تھا کہ اتنے بڑے جہنم کی بنیاد ڈال گیا جہاں ہر صبح لاکھوں

سسی فس اپنا بوجھ اٹھائے حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔ حیرت ہے، اس دیس کی بیٹی اتنا ذرا سا بوجھ نہ
اٹھا سکی۔ اس کی لاش.... کیا کیا؟ وہ مر چکی ہے؟ آہ! لاش بننے کے لئے مرنے کی کیا ضرورت ہے اصل
مسئلہ تو یہ ہے کہ ہمیں ان امور کا جائزہ لینا چاہیئے جو زندگی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اور راستے اور
گلیوں میں، ٹرام اور بسوں میں، دکانوں اور ہوٹلوں میں جو اجسام نظر آتے ہیں ان میں سے کتنے زندہ ہیں؟
دراصل یہ اسلئے گھوم رہے ہیں کہ مورگ میں جگہ نہیں ہے، جب ایک انسان خون کرتا ہے تو دنیا کی تمام
عدالتوں سے اسے سزائے موت یا سزائے عمر قید دینے پر تل جاتی ہیں۔ مگر جب ایک نیم پاگل انسان کسی
نوبل کاز کے نام پر ہزاروں کی جانیں لیتا ہے تو سنگ تراش اس کی مورتیاں تراشنے میں مصروف ہو جاتے
ہیں، مصور اپنے کینوس پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور شاعر کی MUSE جاگ اٹھتی ہے۔ تبھی تو میں کہتا ہوں
خدا نہیں ہے، ممکن ہے جسے تم موت کہتے ہو وہ قدرت کو اپنا نظام قائم رکھنے کے لئے بنانی پڑی ہو جس
طرح لیبارٹری میں کوئی دھماکہ کیا جاتا ہے۔ ابے یہ کیا بکواس ہے، خدا کہاں سے آگیا۔ اسے تو ڈارون
آج سے برسوں پہلے مار چکا ہے۔ نہیں، ڈارون نہیں، یہ ڈیموکریٹس تھا یونانی فلسفی جس نے پوری
یونیورس کی بنیاد ایٹم کے مجنونانہ رقص پر رکھنے کی کوشش کی تھی، یہ فلسفی لوگ سارے ہوتے ہی ایسے
ہیں۔ زندگی میں کوئی بھی اچھی چیز ہو اسکے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ ان کا بس چلے تو مونا لیزا کی مسکراہٹ تک
کو کسی موٹی سی، بدبودار، کرم خوردہ کتاب کے اندر دفن کر دیں۔ یہ مونا لیزا کہتے وقت تمہارا ہاتھ اپنے
زیر ناف کیوں چلا گیا؟ جانے کیوں، اگر مجھے مونا لیزا کی مسکراہٹ پسند نہیں، اسکے سامنے میری اپنی
مسکراہٹ دم توڑ جاتی ہے۔ واقعی ہم نے اپنی معصوم روحوں پر غلیظ جنسی کا خلاف چڑھا لیا ہے۔ اسی
لئے تو اس دور میں ڈاونشی کے بجائے ہفیز پیدا ہوا اور اس نے ہمیں مونا لیزا کی مسکراہٹ کے بجائے
بلے بوائے کلچر دیا۔ مگر رکو، دیکھو دریا میں ایک لاش بہتی چلی جا رہی ہے۔ ادھر آنکھ تجسس سے مت ناکو،
ورنہ لوگ ہمیں بزدل قرار دیں گے۔ لگ رہا ہے مالتھیوزین تھیوری نے اپنا کام شروع کر دیا ہے وہ
کیسے؟ وہ ایسے کہ اب اخبار اٹھا کر دیکھو تو تمہیں ایک بھی دن ایسا نظر نہ آئے گا جب سینکڑوں اموات
کی خبریں نہ چھپ رہی ہوں۔ تب تو ان اخبار والوں کا بن آیا ہوگا۔ خاک بن آیا ہوگا۔ ابے آدمی اخبار
محض OBITUARY کا کالم دیکھنے کے لئے کھولتا ہے کیا؟ کچھ بھی کہو، اب پڑھنے کے لئے آدمی کے پاس
بہت کم وقت رہ گیا ہے۔ وہ اتنا کچھ جان چکا ہے کہ اب وہ یہ بوجھ نہیں اٹھا سکتا اور وہ اسے ایل ایس

ڈی، ایچ لارنس اور امیتابھ بچن میں جھولنے میں مصروف ہے۔ اور مذہب اور نیشنلزم کیا ہیں؟
مذہب پر مجھے یاد آیا۔ کل رات مجھ سے ایک بھاری غلطی کا ارتکاب ہو گیا۔ کیا تم پیدا ہو گئے؟ اونہہ مذاق
نہیں، پیدا ہونا تو ایک حادثہ تھا۔ دو ایٹم آپس میں ٹکرائے اور سالا کوئی جا پھنسا جال میں۔ خیر تو اس ایٹم
کے ساتھ کل رات کیا واقعہ پیش آیا؟ بھئی تم لوگ شرمندہ کرو گے۔ نہیں پہلے وعدہ کرو۔ او وعدہ۔ وہ....
وہ.... ہاں، ہاں، بولو جانِ من، اس میں شرمانے کی بات ہے؟ کہہ ڈالو۔ وہ یہ کہ.... کہ کل رات میں ناخدا مسجد
کے سامنے سے گذرتے گذرتے یکایک اندر چلا گیا۔ قہ.... قہ.... قہ.... میں نہ کہتا تھا تم لوگ ہنسو گے۔ ہا، نہیں
نہیں تو کیا کریں۔ تم زیادہ سے زیادہ عشاء کی نماز پڑھنے چلے گئے ہو گے اور تحریمہ باندھ کر تمہیں یاد آیا
ہو گا کہ تم سب کچھ فراموش کر چکے ہو اور بحیثیت مسلمان کے تمہارے پاس اپنے ختنہ کے علاوہ اور کچھ باقی
نہیں رہ گیا ہے۔ ارے نہیں یار، آگے سنو۔ میں نے نماز پڑھی اور واپس باہر آیا دیکھا چپلیں غائب تھیں
غائب؟ ہاں، اور تفتیش کرنے پر پتہ چلا کہ سب لوگ جوتے بغل میں دبا کر اندر جاتے ہیں یار وہاں میں
لیٹ کر نماز ادا کرتے ہیں۔ تو پھر تم ننگے پاؤں گھر لوٹے ہو گے؟ نہیں۔ تو؟ میں ایک دوسرے شخص کی چپل
پہن کر چلتا بنا۔

"وِل یو پلیز شٹ اپ۔ میں ایک بم کا دھماکہ سن رہا ہوں۔"

ٹرام اور بس ایک طرح کی مشینیں ہیں جو لڑکیوں کو قبل از وقت جوان بنانے میں کافی معاون
ثابت ہوتی ہیں۔ کل لوکل ٹرین میں باٹا نگر سے لوٹتے وقت، رش آور میں میں ایک لڑکی کو ڈھکیلتا ہوا
کونے میں لے گیا۔ مگر یار، کچھ لڑکیاں اتنے بے ڈھنگے طور پر بنائی جاتی ہیں کہ لطف ہی نہیں آتا۔ انگلیوں
کو گوشت کے لمس کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ بس پسلیاں ہی پسلیاں۔ ارے رے رے۔ دیکھو رمضان
دونوں پہرے داروں کو ڈھکیلتا ہوا شہید مینار کے اندر گھس گیا ہے۔ اسے روکو۔ چلاؤ مت، ابھی
دونوں سنتری اسے ڈنڈے برساتے ہوئے نیچے لے آئیں گے۔ نہیں، کیونکہ ابھی تم ایک بھیانک حادثہ
دیکھو گے۔ وہ کیسے؟ وہ ایسے کہ رمضان اس مینار سے کود کر خودکشی کرنے والا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ میں
ایسٹمین کے سامنے کے صفحے پر مروں گا۔ اور تم یہ جانتے ہوئے بھی خاموش رہے؟ تو تم سمجھتے ہو کہ تم اسے
خودکشی کرنے سے روک سکتے تھے؟؟؟

وہ دیکھو وہ ریلنگ سے لگا کھڑا ہے۔ میرے خیال میں وہ دونوں سنتریوں کو نیچے کود جانے کی

دھمکی دے رہا ہے۔ مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے نسلِ آدم کا وہ راز جان لیا ہو جس کی تلاش میں روزِ ازل سے سب لوگ سرگرداں ہیں اور اب وہ پوری دنیا کو یہ راز بتانا چاہتا ہو۔ آخر اتنی بلندی پر جانے کا اس کا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے؟

آہ، بے چارا رمضان، بیسویں صدی کا برخود غلط سقراط، وہ اب بھی کود پڑے تو ان دونوں سنتریوں سے بچ سکتا ہے، مگر مجھے رمضان پر بھروسہ نہیں۔ اسے نیچے مجمع لگا کر لطف آ رہا ہوگا۔ جو آدمی اپنی زندگی کے تئیں کبھی سنجیدہ نہ ہوا ہو وہ بھلا موت کے معاملے میں کب سنجیدہ ہونے لگا۔ میں تو چلا سامنے پبلک یورینل میں پانچ پیسے دے کر پیشاب کرنے۔

ذرا ایک پانچ پیسے دینا!!

●●●●

جاگتے مجسّمے اور ویمپائر

ایک عظیم الشان عمارت، راہداریوں اور غلام گردشوں کا غیر مختتم سلسلہ، ایک وسیع و عریض ہال جس کے وسط میں استادہ ایک بیضوی میز، میز کے گرد اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتی ہوئی قیمتی آبنوسی کرسیاں، کرسیوں سے مخصوص فاصلوں پر نصب پتھر کے برہنہ انسانی مجسمے، کھڑکیوں پر دبیز دبیز پردے — اکثر میں سوچا کرتا ہوں، یہ چیزیں میرے دماغ پر اس بری طرح سے قابض ہیں کہ میں اس عظیم الشان عمارت کے اندر دائمی طور پر قید ہو کر رہ گیا ہوں۔ مگر ان تصویروں کے اثرات میرے ذہن پر کب مرتب ہوئے، کب میں انہیں اپنے پردۂ ذہن سے دھونے میں کامیاب ہو جاؤں گا، شاید میں کبھی نہ جان پاؤں زیادہ سے زیادہ میں ان راہداریوں میں تیزی سے بھاگ سکتا ہوں، ہال کے اندر کسی کرسی پر بیٹھ کر کچھ سوچ سکتا ہوں، کسی مجسمے کے سامنے ٹھہر کر فیصلہ دے سکتا ہوں کہ اس کے جو پستان ابھارے گئے ہیں جسم کے تناسب سے وہ ٹھیک ہیں یا نہیں یا اسے اسکی موجودہ شکل دیتے وقت سنگتراش کے ذہن میں فنِ سنگتراشی کا کون سا اسکول کام کر رہا ہوگا۔ یا پھر دبیز پردوں کو ہٹا کر باہر تاکنے کی کوشش کر سکتا ہوں جہاں روزِ ازل سے موجیں چٹانوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے جی رہی ہیں اور شام سورج کے چہرے پر کالک ملنے کے لئے بیتاب ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ زور سے چلا کر میں کوئی گیت گا سکتا ہوں۔ لیکن میرے گیت نہ یہ مجسمے سمجھ سکتے ہیں نہ دوڑتی موجیں۔ صرف میں ہال سے راہداریوں تک اور راہداریوں سے ہال تک اس آواز کو دوڑ لگاتے سن سکتا ہوں۔ مگر میرے لئے بند دروازوں کے سامنے ٹھہر کر یہ سمجھنا ناممکن ہے کہ ان بند کمروں کے اندر کبھی کوئی رہا بھی ہوگا۔

اس طرح گذشتہ بیس برس سے میں اکیلا جی رہا ہوں۔ کبھی کبھار بہت زیادہ دستک دینے پر کوئی دروازہ کھل جاتا ہے۔ مگر اندر تاریکی میں کچھ سجھائی نہیں دیتا اور میں ایک بار پھر ہال میں واپس لوٹ آتا ہوں اور کرسی پر بیٹھ کر سوچنے لگتا ہوں۔ مگر میرے پاس سوچنے کے لئے کبھی کچھ نہیں رہا صرف دیواریں دروازے، پردے، کرسیاں اور مجسّے ___ میرے سوچ کا دائرہ انہیں تمام چیزوں کا احاطہ کرتے ہوئے واپس لوٹ آتا ہے اور اسکے مقامِ اتصال پر میں حیران و پریشان کھڑا ملتا ہوں۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوا ہے کہ مجھے اپنے آپ کو ان چیزوں میں شامل کرنا پڑا ہے تاکہ سوچنے کے لئے مواد میں اضافہ ہو۔ لیکن میں نے جب بھی ایسا کیا ہے مجھے دلسوز ذہنی اذیت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ خود کو جاننے کی طرف پہلا قدم ہی میرے لئے اتنا المناک ثابت ہوا ہے کہ آج تک میں اپنے وجود کا گناہ معاف نہیں کر پایا ہوں۔

تو اس خود آگہی کے جال سے نکلنے کے لئے میں ایک نیا طریقہ آزماتا ہوں اور ہال کے مجسّوں میں سے ایک کا انتخاب کر کے اسے گوشت پوست کا ایک انسان سمجھ کر اس سے گفتگو شروع کر دیتا ہوں

"تم کب سے یہاں پر ہو؟"

"جب سے تم ہو۔"

"اور کب تک یہاں رہو گے؟"

"جب تک تم رہو گے۔"

"اگر میں تمہیں توڑ کر سمندر میں ڈال دوں؟"

"کوشش کرو۔"

واقعی یہ ناممکن تھا کیونکہ میرے پاس اسے توڑنے کے لئے کوئی ہتھیار نہ تھا۔ خود کو تخریب کے اتنے نااہل پا کر میں جھنجلا اٹھتا ہوں اور اپنے بازو آزماتا ہوں، مٹھیاں استعمال کرتا ہوں یہاں تک کہ انگلیوں کی پوروں سے خون کی دھار بہہ نکلتی ہے اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ میرا خون اسکے جسم پر جہاں جہاں گر رہا ہے وہ حصّہ گوشت پوست کا بنتا جا رہا ہے۔ میں اچھل کر پیچھے ہٹ جاتا ہوں اور اپنی زخمی ہتھیلی کا معائنہ کرتے ہوئے مجسّے کی آنکھوں میں تاکتا ہوں جو خون کی گرمی پا کر زندہ ہو چکی ہیں۔

"میں اسی لمحے کا انتظار کر رہا تھا۔" وہ مسکرا کر کہتا ہے۔" اپنے خون کی مزید تھوڑی سی مقدار

سے محروم ہونا گوارا کرو تو میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ سکتا ہوں۔"

"نہیں، مجھے یہ سودا منظور نہیں۔ یہاں خون بہت قیمتی ہے کیونکہ پوری عمارت میں صرف میری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔"

"ایک وقت تھا جب ہماری رگوں میں بھی دوڑا کرتا تھا۔"

"اس وقت میں کیا تھا؟"

"ہماری طرح پتھر کے ایک بے جان مجسمہ تھے۔ ہم فنکاروں نے مل کر اپنے فن کی تمام جولانیوں کے ساتھ تمہیں پتھر کے ایک بدصورت سے ٹکڑے سے تراش کر باہر نکالا تھا۔ جو کچھ جس فنکار کے پاس تھا وہ سب کچھ اس نے تمہیں سونپ دیا تھا۔ گرچہ تم ہمارے ہاتھوں وجود میں آئے تھے مگر ہم سے بہتر بن گئے تھے لیکن تم پھر بھی ایک بے جان پتھر تھے۔"

"کہے گئے کہو، پہلی بار مجھے اپنی موجودگی کا اعتراف کرنے میں اذیت کا احساس نہیں ہو رہا ہے۔"

"پھر ہم لوگوں نے فیصلہ کیا کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے خون کا ایک چوتھائی حصہ تمہیں بخش دیگا تاکہ تم ایک مکمل شاہکار بن سکو اور ہم فخر کے ساتھ تمہیں دنیا کے سامنے پیش کر سکیں اور ہم نے اپنا ایک چوتھائی خون تمہاری رگوں میں ڈال دیا۔ لیکن یہ بھی تمہارے لئے ناکافی ثابت ہوا اور ہم نے اپنے باقی بچے ہوئے تین چوتھائی خون سے نصف خون تمہیں دے دیا۔"

"کیا تم میں سے ہر کوئی اتنا طاقتور تھا کہ اتنے خون سے محروم ہو کر بچ سکتے تھے؟"

"ہاں، کیونکہ ہم فنکار تھے اور ہمیں اس کی عادت تھی۔ لیکن تمہارے معاملے میں ہم سے ایک غلطی سرزد ہو گئی۔ ہم نے تمہیں اتنا خون پلا دیا کہ تم توقع سے کہیں زیادہ طاقتور ہو گئے اور ایک رات جب ہم سو رہے تھے تم نے اٹھ کر چپکے سے ہماری رگوں کا آخری قطرہ تک چوس لیا اور ہمیں ان ستونوں پر سجا دیا۔"

"مگر مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں۔"

"اس لئے کہ تم جتنا خون پیتے رہے تمہارے اندر ایک نئے نقطۂ نظر کا الہام ہوتا رہا۔ ہر نئے قطرے کے ساتھ تم ویمپائر کی طرح بدلتے رہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے بدلتے رہے اور ہم لاچار اور مجبور سے تمہیں بدلتے دیکھتے رہے جس طرح اس وقت دیکھ رہے ہیں۔"

وہ خاموش ہو جاتا ہے اور میری نظر دوسرے مجسموں کی اور دوڑ جاتی ہے۔

یہ دیکھ کر میں اچھل ہی تو پڑتا ہوں کہ ان تمام مجسموں کی آنکھیں جاگ رہی ہیں اور یکساں بے کیفی اور نفرت کے ساتھ مجھے گھور رہی ہیں۔

تب سے اس عمارت میں، میں تنہا نہیں رہتا۔ اپنی زندہ جاوید آنکھوں کے ساتھ ہال کے تمام مجسّے میرے ساتھ جیتے ہیں۔ گرچہ میں نے کھڑکیوں کے دبیز پردوں کو پھاڑ کر ان کی آنکھوں پر پٹیاں کس دی ہیں اور اس طرح ان کی نفرت انگیز نگاہوں سے خود کو بچا لیا ہے، لیکن کھڑکیوں پر پردوں کے نہ ہونے سے اب رات دن سمندر کا شور مجھے بے چین کئے رہتا ہے۔ اس شور سے بچنے کے لئے میں ہال اور راہداریوں کے اندر بھاگتا رہتا ہوں۔ بھاگتے بھاگتے کبھی کبھار اس اندیشے سے میرا دل کانپ اٹھتا ہے کہ میں کہیں کسی مجسّے سے ٹکرا نہ جاؤں اور اسکی آنکھوں سے پٹی کھل جائے۔

میرا شہر کلکتہ

آزادی کو تیس سال کا ایک طویل عرصہ گذر چکا تھا۔ مادرِ وطن کی آب و ہوا کافی حد تک تبدیل ہو چکی تھی اور ابنائے وطن نے اپنی زبان، اپنے کلچر کو پہچاننا شروع کر دیا تھا کہ یکایک نومبر کی ایک خنک شام کو کلکتہ کی ایک سڑک پر چلتے چلتے مجھ پر اس تلخ حقیقت کا انکشاف ہوا کہ میرے سر پہ نہ کوئی آسمان ہے نہ جیب میں پیٹ بھرنے کے لائق پیسے۔ زندہ رہنے کے لئے آدمی کو جن سہاروں کا محتاج ہونا پڑتا ہے وقت نے سنِ شعور تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ تمام سہارے مجھ سے چھین لئے تھے۔ چنانچہ میں نے اپنے دونوں ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال دئے، سر کو کالروں کے درمیان کسی قدر اونچا اٹھا لیا اور بے چینی کو پوشیدہ رکھنے کے لئے مسکرانے کی سعی کرنے لگا جو اور کچھ نہیں نفسیاتی طور پر ڈیفنس میکنزم کی ایک شکل ہی تھی۔ مگر مجھے دیر ہو چکی تھی۔ اس وقت تک موسم سرما کی ٹھنڈی ہوا وسط ایشیا سے چل کر شمال کے یخ بستہ پہاڑی دروں سے بہتی ہوئی گنگا کی گھاٹیوں اور میدانوں سے گذرتی، خلیج بنگال اور بحرِ ہند کی طرف جا رہی تھی۔

۱۹۷۷ء کی پوری گرمی اور برسات کے کچھ ہفتے میں ایک ڈاکٹر کے کمپاؤنڈر کی حیثیت سے کام کرتا رہا تھا۔ ڈاکٹر کو میرا کام پسند تھا اور اس کی پر بہار شخصیت کی چھاؤں میں آ کر آخر کار مجھے اپنے پیروں کے نیچے زمین کی موجودگی کا احساس ہونے لگا تھا کہ یکایک استقاطِ حمل کے بہت سارے کیسز آنے لگے۔ چنانچہ میں نے ڈاکٹر سے اجازت لی اور سر کے لمبے بالوں کو، جو بے موسم پسینے سے بھیگ گئے تھے، کھلی ہوا میں خشک کرنے کے لئے سڑک پر نکل آیا۔

بات دراصل یہ تھی کہ اپنے لمبے بالوں، بیل باٹم اور اونچی ایڑیوں کے باوجود میں ذرا پرانے خیالات کا آدمی تھا۔ میری تمام کوششوں کے باوجود میرے اندر کہیں پر "ہندوستان" زندہ رہ گیا تھا۔ اور اب میں اپنی قدروں کی لاش کندھے پر اٹھائے ہوئے ایک تاریک اور بے رحم رات کے روبرو کھڑا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسکا استقبال کس طرح سے کروں۔ مجھے ہندوستان کے مختلف شہروں میں ستائیس سال گذر گئے تھے۔ مگر میں بنگال کی راتوں کو سمجھ نہ سکا تھا، یہ راتیں جو کسی راکشش کی طرح ہر شئے کو نگل لیتی ہیں اور پیچھے چھوڑ جاتی ہیں گھٹی ہوئی سسکیاں، دبی ہوئی آہیں ــــــ میں شباب کے سنہرے دور میں قدم رکھ چکا تھا۔ مگر کسی کی کنواری نگاہوں نے مجھے پیام نہیں بھیجا تھا، کسی کے ملائم سینے کی گرمی میں نے محسوس نہیں کی تھی۔ میں زندگی کے میدان میں ایک ایسی سمت ڈھکیل دیا گیا تھا جہاں ان چیزوں کا گذر ممکن نہیں تھا۔ میں اس بنگال میں جی رہا تھا جسے ہر آنے والا دن لوٹ رہا تھا، ہر رات جس کی عصمت دری کر رہی تھی۔ میں تاریک اور مفلس بنگال کا بیٹا، اپنی ماں کے دم توڑتے ہوئے جسم میں جان ڈالنے کی بھر مقدور کوشش کر رہا تھا اس سے قطع نظر کہ خود میری سانسوں کی تعداد بہت مختصر رہ گئی تھی۔

میں زیادہ دور نہیں جانا چاہتا تھا۔ دراصل مجھے اپنی حد سے واقفیت تھی۔ میں نے کبھی خود کو دو سانسوں کے درمیان کا خدا نہیں سمجھا تھا۔ لیکن یہ رات کہیں جانے کے لئے کہہ رہی تھی، کسی ایسی جگہ جہاں ہوا شیشے کے دروازوں کو نہ کھڑکھڑاتی ہو، نہ روشنیاں اتنی تیز ہوں کہ انسان کے گرد سائے ہی سائے پھیل جائیں۔ مگر کلکتہ ایک ایسے سمندر کی طرح ہے جس کی تھاہ سے کوئی واقف نہیں اس کا طلسم اس درجہ مضبوط ہے کہ دل کسی نہ کسی فریب کا خوگر ہو ہی جاتا ہے۔ چنانچہ چترنجن ایونیو میں کچھ دور چلنے کے بعد مختلف گلیوں اور راستوں سے چکراتے ہوئے میں آخر کار بنٹنگ اسٹریٹ پر نکل آیا جہاں بہت ہی پر اسرار طور پر میں نے خود کو پر ہجوم، پر شور سڑک پر ایک جنرل اسٹور کے سامنے کھڑا پایا، جہاں ایک ڈسٹ بن کے کنارے چبوترے پر ایک بوڑھا آدمی بیٹھا اپنی کھری ٹھنڈی بھوؤں سے کلکتہ کے دل کے اندر تاک رہا تھا۔ اس کے کندھے اتنے مضبوط تھے کہ لگتا تھا آج کی پوری تہذیب، خوشحالی اور کلچر کا بوجھ ان کندھوں پر رکھا ہوا ہو۔ دوسری طرف اس کی آنکھوں میں شدید تھکن اور مایوسی تھی کیونکہ وہ ایک ایسی عمارت کا معمار تھا جس کے اندر خود اس کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا

گیا تھا۔ میں نے مڑ کر جنرل اسٹور کے روشن، وسیع و عریض زینے پر چڑھتے اترتے لوگوں کی طرف دیکھا۔ گل گوتھن لڑکیاں کافی کاؤنٹر پر کافی سپ کر رہی تھیں۔ مرد نیچے ٹریفک کے بہتے ہوئے دھارے میں نظریں ٹکائے ہوئے سگریٹ پی رہے تھے۔ بچے وزن کی مشین کے سامنے کھڑے چوکور خانے کی سرخ علامتی روشنی کو متجسس نگاہوں سے تاک رہے تھے اور میں بوڑھے کے اتنے قریب تھا کہ میرے کانوں میں اسکی کراہوں کی سرگوشی سنائی پڑ رہی تھی جیسے کلکتہ کسی میلنی ٹوریم میں لیٹا کراہ رہا ہو۔

"کیا تم بیمار ہو؟" میں نے جھک کر بوڑھے سے سوال کیا۔

"میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔" اس نے تھکی سی آواز میں جواب دیا۔

"تمہارا اپنا کوئی نہیں؟"

"میرا لڑکا عمارت میں اینٹیں ڈھویا کرتا تھا۔ ایک دن اوپر سے گر کر مارا گیا۔" وہ جس بے ساختگی اور سکون سے یہ بتا رہا تھا۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ بہت پہلے کا واقعہ ہے۔ شاید پانچ چھ سال پیچھے کا۔

"تو ان لوگوں نے تم سے تمہارا بیٹا چھین لیا ہے؟" میں نے دھیرے سے کہا جو شاید اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ "تمہاری عمر کتنی ہے؟"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے، آزادی کے دن میں چھبیس سال کا تھا۔"

"تو تم جنگِ آزادی میں حصہ لے چکے ہو۔ تبھی تو تمہیں وہ دن اتنی اچھی طرح یاد ہے۔" میں نے کہا

"نہیں، اس کی ایک دوسری وجہ ہے۔ آزادی کے پانچ چھ ماہ پہلے سے کلکتہ میں تقسیمِ ہند کے فسادات شروع ہو چکے تھے۔ ایک بار میں اور للنی ایک جلسے میں گئے۔ جلسے میں پتھراؤ ہوا۔ گولیاں چلیں اور میری بیوی ماری گئی۔ اس لئے مجھے آزادی کا دن اتنی اچھی طرح یاد ہے۔"

"اس کا مطلب ہے تم گذشتہ تیس چالیس برس سے اسی طرح محنت کرتے آ رہے ہو۔" میں نے محسوس کیا کہ میں ذرا بے چین ہو گیا تھا۔ کتنا اچھا ہوتا اگر میں اس بوڑھے کے سامنے نہ رکتا۔ میرے پاس دوسروں کی طرح اسے دینے کے لئے جھوٹے وعدے نہ تھے۔ رنگین سپنے نہ تھے۔ اسی لئے میں نے اسے ایک اور بے رحم حقیقت کے سپرد کر دیا۔

"کچھ عرصہ بعد جب تم بالکل ضعیف ہو جاؤ گے پھر کیا کرو گے؟"

دراصل میں نے اس سے ایک ایسا سوال کیا تھا جو مجھے کسی دوسری جگہ کرنا چاہئے تھا۔ مگر وہاں سنگینوں کا سخت پہرا لگا ہوا تھا۔ اور میرا اندر جانا قطعی ناممکن تھا۔ اسی لئے میں نے پھر بوڑھے کی طرف رجوع کیا۔

میں نے دیکھا، بوڑھا خاموش بیٹھا آکاش میں چمکتے ہوئے نیون لائٹ کے اشتہارات کو تاک رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا۔ اس کے پاس میری باتوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ مگر میں کیوں اس کی طرف ضدی نگاہوں سے تاک رہا تھا؟ اسکی پیشانی کو بگاڑتی ہوئی سلوٹیں اتنی گہری پڑ گئی تھیں کہ میں نے خوفزدہ ہو کر نظریں وہاں سے ہٹالیں اور میری نگاہیں ایک دوسرے بوڑھے بھکاری پر مرکوز ہوگئیں جو اپنے چیتھڑوں کے ساتھ سڑک پار ٹرام کی پٹری پر دھیرے دھیرے پاؤں رکھتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے چیتھڑے اتنے نمایاں اور ناگزیر نظر آرہے تھے جیسے ان کی اپنی الگ شخصیت ہو اور جیسے وہ بھکاری ان چیتھڑوں میں نہیں، بلکہ ان کے لئے جی رہا ہوں۔ کتاب کی دکانوں کے نیچے سے گذرتے ہوئے، ان کی تیز روشنیوں میں وہ اور بھی زیادہ بدنما اور بھیانک نظر آرہا تھا۔ جیسے سب کی نظر بچا کر چپکے سے گورکی کی کسی کتاب سے نکل آیا ہو۔ میں نے چاہا میں اپنی آنکھیں بند کرلوں۔ مگر تبھی —— بڑے پراسرار طور پر اور یکایک، اس ڈسٹ بن کے کنارے بیٹھے ہوئے بوڑھے کا مستقبل میری سمجھ میں آگیا اور میں نے سوچا، دراصل کلکتہ نہ چمکتی ہوئی دکانوں کا نام ہے، نہ کشادہ سڑکوں، تنگ گلیوں اور کھلے میدانوں کا، نہ سجے ہوئے فلیٹوں کا، نہ امپورٹیڈ کاروں کا اور نہ ہی کھوکھلی نمائشوں کا، کلکتہ وہ بھی نہیں جو دریائے ہوگلی کے کنارے سے شروع ہو کر بنگلہ دیش تک پھیلا ہوا ہے۔ نہ کلکتہ رائٹرس بلڈنگس میں ہے، نہ وکٹوریہ میموریل میں، نہ ایڈن گارڈن میں ہے، نہ انڈین میوزیم میں اور نہ ہی راج بھون میں۔ کلکتہ نہ ٹرام کے شور میں ہے نہ آکاشوانی کی نشریات میں، کلکتہ وہ بھی نہیں جو اوبرائے گرانڈ کے فلور شو یا شہزاد اور پرنسز یا فرپوز کے مشہور و معروف لائسنس یافتہ لیڈو بار۔ یا گرانڈ کے رنگ محل میں نظر آتا ہے یا جسے ہم رویندر سدن یا برلا پلینی ٹوریم میں دیکھتے ہیں یا جو دھرم تلہ میں شہید مینار کے اردگرد نظر آتا ہے یا جو کالی مندر، ناخدا مسجد یا سینٹ پال کیتھڈرل کے صحنوں کی بھیڑ میں سانس لیتا ہے۔ کلکتہ دراصل ڈسٹ بن کے کنارے بیٹھے ہوئے اس بوڑھے مزدور سے شروع ہو کر سڑک کی دوسری اور چلتے ہوئے اس بوڑھے بھکاری تک جا کر ختم ہو گیا ہے جو دھیرے دھیرے کلکتہ کے

عین خانۂ دل میں سماتا جارہا ہے۔

اُف! میرا شہر کلکتہ کتنا چھوٹا ہے۔

"کون جانے۔۔۔۔" بوڑھا دھیرے سے مجھ سے کہہ اٹھتا ہے۔ جیسے خود کلکتہ مجھ سے سرگوشی کررہا ہو، "وہ وقت آنے سے پہلے ہی میں دم توڑ دوں۔ میرے پاس اب جینے کے لئے رہا کیا ہے؟ میں تو اسی دن مرگیا تھا جس دن بلرام مرا تھا اور ان لوگوں نے مجھے پانچ سو روپے ہرجانہ دینے چاہے۔ بھلا کون باپ یہ پیسہ سویکار کرسکتا ہے؟"

●●●●●

اُونگھتی آرام کُرسی

"مسٹر بھٹناگر، ابھی تک آپ نے سہ ماہی اسٹیٹمنٹ تیار نہیں کیا! یہ کام اسی ہفتے ہو جانا چاہیئے"
مجھے معلوم ہے یہ مجھ سے ہی کہا جا رہا ہے۔ کبھی کبھار اپنا نام بھول جانے میں کتنی راحت کا
احساس ہوتا ہے۔ لیکن انسان اپنے نام کی کینچلی کب اپنی شخصیت سے اتار سکتا ہے؟ مجھے تو مرنے
کے بعد بھی لوگ بھٹناگر ہی کہینگے۔ انسان کو دنیا میں آنکھ کھولتے دیر نہیں لگتی کہ اس پر ایک لیبل
لگا کر اسے ایک خانے میں چپکا دیا جاتا ہے۔

"یس سر"

"دیکھیے، آپ آج کل کام میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہے ہیں۔"

"سر جی"

"کچھ دنوں سے میں دیکھ رہا ہوں آپ پریشان سے ہیں۔ کوئی گھریلو الجھن ہے؟"

"کچھ بھی تو نہیں سر، تھینک یو!"

کچھ دنوں سے میں بھی محسوس کر رہا ہوں کہ میں پریشان سا رہنے لگا ہوں۔ مگر اس گنجے
کو کسی کے گھریلو معاملات میں جھانکنے کی اتنی بے چینی کیوں رہتی ہے؟ کیا یہ نہیں جانتا کہ جو تنخواہ مجھے
آفس دیتا ہے اس سے میری پریشانیوں میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ مگر یہ بھی کیا کرے۔ اس کے سارے
کام تو ماتحت کر دیتے ہیں۔ وقت گذاری کے لئے کچھ تو چاہیئے۔ کسی کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی ہی
سہی۔ آفس کا ہر شخص جانتا ہے کہ اس کی بیوی اسکی آنکھوں میں دھول جھونکتی ہے۔ مگر محض اسی لئے

تو لوگ اسے پسند کرنے سے رہے۔ اور یہ ہے کہ اپنی بیوی پر رعب جمانے کی فکر میں مرا جاتا ہے۔ اگر کسی کام سے وہ آفس چلی آتی ہے تو صاحب کے اندر اپنے صاحب پن کا احساس انگڑائی لے کر جاگ اٹھتا ہے، پھر ہر شخص کی باری باری سے پکار شروع ہو جاتی ہے۔

"مسٹر احمد، آپ نے جو ڈرافٹ تیار کیا ہے وہ بہت کمزور ہے۔ آپ دوسرا ڈرافٹ لکھ لیں۔"

"مسٹر مرلی، آپ کی ٹائپ رائٹنگ دن بدن بگڑتی جارہی ہے۔ مجھے لگتا ہے آپ کی مشین کو نہیں بلکہ آپ کے ذہن کو سروسنگ کی ضرورت ہے۔"

"مسٹر ستیش، ذرا کورس پونڈ نیس فائل تو لیتے آئیے۔"

"مسٹر بھٹناگر، گھر کی پریشانیاں گھر ہی تک محدود رہیں تو بہتر ہے، ورنہ آدمی پاگل ہو جائے۔"

"آئی ایم سوری سر۔ آئی ایم رئیلی ویری سوری۔"

اور اس کے بغل میں بیٹھی یہ عورت جو میری طرف تاک رہی ہے، کتنی نفرت ہے مجھے اس سے یہ سوچ کر تعجب ہوتا ہے کہ کسی کو اسکے بھدے جسم سے دلچسپی بھی ہو سکتی ہے۔ ایسی عورتوں کے بارے میں ہی کہا جاتا ہے کہ ان کی ٹانگیں ہمیشہ ایک دوسرے سے الگ رہتی ہیں۔

کونے میں ٹائپ رائٹر بڑبڑا رہا ہے۔ باہر سڑک پر پہیے دوڑ رہے ہیں۔ پارلیامنٹ میں ممبران لڑ رہے ہیں، جس کی سیٹھی روداد سنانے کے لئے رپورٹر اور فوٹو گرافر راہیوں اور راہداریوں میں بھاگ دوڑ میں مصروف ہیں۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے میں تھوڑی دیر کے لئے یہ بھول جانا چاہتا ہوں کہ میں کہاں ہوں، کیا ہوں؟ زمان و مکان کے اس لا مختتم سلسلے میں میرا مقام کہاں ہے؟ لیکن میرا ذہن خود مجھے ان تمام سوالوں کو فراموش کر دینے سے باز رکھتا ہے۔ یہ ٹائپ رائٹر اگر رک جائے تو ممکن ہے میں اس مسئلے کا حل دریافت کر لوں۔ اور جب کہ مجھے یہ یقین ہونے لگتا ہے کہ ٹائپ رائٹر یوں ہی تا قیامت بڑبڑاتا رہے گا، یکایک مشین خاموش ہو جاتی ہے۔

"تم نے مجھ سے کچھ کہا؟"

"نہیں تو۔"

ٹائپ رائٹر چل پڑتا ہے۔ تو میں سوچ رہا ہوں، میں سوچ رہا ہوں، میں سوچ رہا ہوں۔ مگر میں کیا سوچ رہا ہوں؟ کچھ بھی تو نہیں۔ شاید میں سوچ رہا ہوں کہ سندیپ کے لئے یونیفارم نہیں

بنائی تو اسے اسکول میں گھسنے نہیں دیا جائے گا۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ تم جب بھی سوچتے ہو ایک چار سو روپے مہینہ پانے والے کلرک کی طرح سوچتے ہو۔ تم آئن اسٹائن کی طرح کیوں نہیں سوچتے ہو؟ بے تھون کی طرح کیوں نہیں سوچتے ہو؟ چرچل کی طرح کیوں نہیں سوچتے ہو؟ یہ مت بھولو کہ تم تاریخ کے ایک انتہائی اہم موڑ پر کھڑے ہو، جب دنیا تیسری جنگِ عظیم کی طرف بڑھ رہی ہے اور بنی نوع آدم پوری رفتار سے اپنی آبادی دگنی سے چوگنی کرنے میں معروف ہے۔

مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں اور میں ایک کپ چائے کا انتظار کرتے ہوئے کینٹین کی دیواروں پر کوئلے سے لکھے گئے سلوگن کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ انسان اپنی تمام تر نام نہاد ترقیوں کے باوجود اب بھی اپنی فطرت کا اصلی چہرہ دیواروں پر کندہ کرنے پر مجبور ہے۔ اسے ہر لمحہ کسی نئے جھوٹ کا سہارا چاہیئے۔ یہ کسی ایک قرآن یا گیتا تک محدود نہیں رہ سکتا۔ نہ ہی اسکے مارکس کو بقائے دوام حاصل ہے۔

"بابو! آپ کیا سوچ رہے ہیں۔ شاید چائے میں شکر زیادہ پڑ گئی ہے؟"

"کیا؟ نہیں تو۔"

میں کینٹین کے مالک کے بیضوی چہرے کی طرف تاکتا ہوں۔ اسے جب کوئی کام نہیں رہتا تو یہ لوگوں کو پڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ٹریجڈی یہ ہے کہ یہ ہمیشہ لوگوں کو غلط پڑھتا ہے۔

"مسٹر بھٹناگر۔ آپ آج کل کینٹین میں بہت زیادہ جانے لگے ہیں۔"

"نہیں تو سر۔ چائے پینے کے لئے تو جایا ہی کرتا ہوں۔"

"آپ چائے پی پی کر اپنا ہاضمہ چوپٹ کر لیں گے۔ شاید آپ نے اب تک یہ کام کر ہی لیا ہو۔ میں دیکھ رہا ہوں آپ میں اونگھنے کی عادت پڑتی جا رہی ہے۔ بے خوابی کی شکایت ہے آپ کو؟"

"شکایت تو ہے۔ مگر مجھے ڈر ہے میں پاگل ہو جاؤں گا۔" میں بالکنی کے جنگلے پر جھکا ہوا آدھی رات کے سناٹے کو اپنے اندر تک محسوس کر رہا ہوں۔ چاندنی کے باوجود آس پاس کی تمام عمارتوں نے مل کر گلی میں روشنی کو آنے سے روک لیا ہے۔ اندر کمرے میں میری بیوی سو رہی ہے۔ اسکی عریانیت کے لئے میں ہی ذمہ دار ہوں۔ جانے کیوں مجھے سر تکیہ پر ڈالتے ہوئے ہول سا آ رہا ہے جیسے تکیہ سے لگتے ہی یہ پتھر کا ہو جائے گا۔ میں اسی طرح کھڑے کھڑے رات گذار دوں گا یہاں تک کہ دور کوئی فیلڈ انجن سیٹی بجاتے ہوئے گذرنے لگے گی اور اتنی دوری کے باوجود میں اس کے ڈبوں کی جھنجھناہٹ کو سن سکونگا۔

"تم کسی ڈاکٹر سے مشورہ کیوں نہیں لیتے ؟" احمد کے پاس ہمیشہ کی طرح میرے لئے بہت سارے سوالات ہیں۔ "تم اپنے آپ کو تباہ کر لوگے۔ یاد رکھو بے خوابی پاگل پن کی ابتدا ہے۔"

"تو کیا میں پاگل نہیں ہوں۔" میں معاملے کو مذاق پر ٹال جاتا ہوں۔ مگر اس کی آنکھیں سنجیدگی سے مجھے پڑھنے میں مصروف ہیں، باس کی آنکھوں کی طرح۔"

"ہمیں انسپکشن کے لئے ابھی سے تیاری شروع کر دینی چاہیئے۔" اپنی بیوی کے بغل میں بیٹھا ہوا وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی نفرت انگیز نظر آرہا ہے۔ وہ اپنی کرسی کی پشت پر سر کو ٹکائے ہوئے ہم سب لوگوں کی طرف تاکتا ہے۔ "انسپکٹنگ اسٹاف کا پر زور استقبال ہونا چاہیئے۔ اور آپ لوگ سرکٹ ہاؤس میں انکے کھلانے پلانے کا کیا انتظام کر رہے ہیں ؟ مسٹر ستیش، میری طرف سے یہ پچاس روپے چندے کے طور پر رکھ لیجئے۔ یاد رکھئے انہیں ہر صورت میں انہیں بھیجنا ہے۔ آپ تمام لوگوں کی فیوچر پرموشن اور ایفی شینسی بار کا دارومدار بہت حد تک ان کی رپورٹ پر ہے کہ یہ کیا کبھی ہے نہیں، میرا آفس آفس کے اندر ہی ختم نہیں ہوتا۔ یہ میرے ساتھ گھر تک جاتا ہے۔ میری بیوی تک جاتا ہے۔ میرے بچوں تک جاتا ہے اور میری بلی روی تک جاتا ہے جنھیں میں گھر میں ایک کلرک کی مانند ہی مشتبہ نظروں سے تاکتا ہوں ــــــ شبے کی جس دیوار کے آر پار ہم لوگ جی رہے ہیں وہ دیوار دیوارِ چین سے زیادہ بلند اور مضبوط ہے اور برلن کی آہنی دیوار کی طرح ہی اس کے آر پار واچ ٹاور نسب ہیں کہ کوئی ادھر سے کود کر ادھر نہ چلا جائے۔

"سکون سے بیٹھ۔" میں روی کا کان اینٹھ کر کہتا ہوں جو میری آرام کرسی کے بازو پر بیٹھی پر اسرار آنکھوں سے میری طرف تاک رہی ہے۔ میں پیالی تپائی پر رکھ کر دوبارہ اخبار کے کالموں میں دفن ہو جاتا ہوں۔ بین الاقوامی سطح پر خبروں کے معیار میں دن بدن گراوٹ آتی جا رہی ہے طہران میں ملا پرستی کے دور کی ابتداء، کارلوپ کی جیت کا یورو کمیونزم پر سیاسی ردِ عمل، ہیون بورگ پر ریڈ بریگیڈ کا سزائے موت کا فیصلہ، جیرمی تھورپ ہم جنسی کے مقدمے میں ملوث، ہیتھرو کے ہوائی اڈے پر ہندوستانی عورتوں کا ورجنٹی ٹیسٹ، اجاڑ کے فسادات میں ہزاروں مسلمانوں کی موت ــــ دنیا کے نقشے پر ملکوں کے درمیان متنازعہ سرحدوں کی ہاٹ لائنز میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، سمندر کے پانیوں میں بحری بیڑے گشت کر رہے ہیں، چین ایک عظیم جنگی قوت بننے کی تیاری

میں مصروف ہے۔ VOYAGER جیوپٹر کی طرف بڑھتا جا رہا ہے اس نے ۔اکی تصویریں بھیجنا شروع کر دی ہے اور ان تمام چیزوں سے دور ایک کلرک اپنی آرام کرسی میں اخبار پڑھتے پڑھتے اونگھ گیا ہے۔ اس کی بلی اب بھی آرام کرسی کے بازو پر بیٹھی اس کے چہرے کی طرف تاک رہی ہے اسکی آنکھوں میں ایک پر اسرار روشنی کھیل رہی ہے جیسے اس نے دنیا و مافیہا سے بے خبر خود اپنے کرب میں غرق اس شخص کو معاف کر دیا ہو ـــــ اس کے اندر کا راز پا لیا ہو۔

●●●●
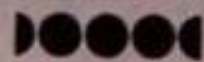
چہروں کے فاصلے

یہ ایک پرانا کمرا تھا جس کی کھڑکیوں میں سلاخیں نہیں تھیں جہاں میں اور نجیب ماں کے ساتھ رہتے تھے۔ ماں چرچ روڈ پر سلائی کے ایک اسکول میں استانی تھی اور اسکول کے بعد جو وقت بچ رہتا وہ ہمیں ماں کے بغیر ہی اس کمرے میں گذارنا پڑتا۔ شام کے وقت ماں شال سے سر کی پشت کو چھپائے ہوئے وارد ہوتی اور فوراً رات کا کھانا پکانے میں معروف ہو جاتی۔ وہ مشکل سے تیس سال کی رہی ہوگی۔ مگر اسی دوران اسے سفید کپڑوں کی عادت پڑ گئی تھی اور کھانا پکاتے پکاتے کبھی کبھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے اور کبھی یہ آنسو کھڑکیوں کے شیشوں پر بہتے رہتے جب بارش سے بوجھل ہوا باہر نیم کے درختوں کے نیچے سے گذرا کرتی۔ اس مکان کے باہر سے ایک ٹوٹی پھوٹی سڑک گذرتی تھی جو شہر کو باہر کی طرف لے جاتی تھی۔ اس پر چلتے ہوئے لوگ ان کھڑکیوں سے اتنے دھندلے، اتنے عجیب سے لگتے، ہماری زندگی سے اتنی دور لگتے کہ میرے اور نجیب کے متعجب سر آپس میں ٹکرا جاتے۔

"یہ لوگ کہاں سے آتے ہیں، اور جاتے کہاں ہوں گے؟" نجیب پوچھتا۔

"مجھے تو نہیں معلوم لیکن ماں بتا سکے گی۔"

ماں کے چہرے پر ایک پرانی مانوس مسکراہٹ جل اٹھتی۔ وہ آٹا سے گیلی ہو چکی انگلیوں کو گملا کے کنارے سے رگڑ کر صاف کرتی۔ پھر دونوں ہاتھ سے ہمارے سروں کو اپنے ملائم سینے سے لگا کر کہتی۔

"یہ تو ہمارے جیسے ہی لوگ ہیں، تم نہیں دیکھتے کہ یہ لوگ کبھی نہیں رکتے ہا ہمیشہ کہیں نہ کہیں جاتے رہتے ہیں؟"

"لیکن یہی تو بات ہے کہ جاتے کہاں ہیں؟" میں اپنی باہیں ماں کے جسم کے گرد حمائل کر کے اسکے خوبصورت چہرے کو تاکتا رہتا۔ "ماں تم تو جانتی ہو گی۔ آخر یہ لوگ دو گھڑی کے لئے ٹھہر کر ہم سے بات کیوں نہیں کرتے؟"

ماں لاجواب ہو کر چولہے کے اندر تاکنے لگتی اور اس وقت اسکا گورا صبیح چہرا اور بھی سرخ ہو اٹھتا۔ اور اکثر رات کو خواب میں، میں ماں کی طرح ہی ایک خوبصورت، ننھی سی لڑکی سے کھیلتا رہتا

"تم تو اتنے موٹے ہو کر بس۔۔۔۔" وہ نیم کے درخت کی جڑوں سے ٹھوکر کھاتے کھاتے سنبھل جاتی اور میری طرف چہرا موڑ کر کہتی، "تم تو اتنے موٹے ہو کہ جب ماسٹر صاحب تمہیں مارتے ہوں گے تو تمہیں بالکل نہیں لگتا ہو گا۔"

"یہ ماسٹر صاحب تو مجھے بالکل ناپسند ہے۔" میں اپنا فیصلہ سناتا، "چھڑی کے بغیر بھی۔"

اور ماں ہم دونوں کو گود سے اتار کر آٹا گوندھنے لگتی اور ہم دونوں ایک بار پھر کھڑکی سے جا لگتے۔ لیکن اس وقت سڑک سنسان پڑی رہتی اور ایک دو لیمپ بجلی کے کھمبوں پر جل رہے ہوتے اور ہوا بجلی کے تاروں کو جھنجوڑتی رہتی، اور کبھی کبھی ان سے چنگاریاں برسا کرتیں۔

لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ موسم خوشگوار ہو اٹھتا اور آسمان میں غروب آفتاب کی لالی دوڑ جاتی۔ اس وقت نیم کا درخت خاموش رہتا اور کھمبوں پر نسب لمپ وقت سے قبل جل اٹھتے اور ہم آنگن میں کھیلتے کھیلتے اکتا جاتے اور میں ہاف پینٹ کی جیب سے چابی نکال کر کمرے کا دروازہ کھولتا۔ ہم دوڑ کر کھڑکیوں کو سرخ آسمان پہ کھول دیتے جس کے نیچے بلب جلتے رہتے اور تاروں پر چڑیاں بیٹھی رہتیں اور سڑک پار محلے میں کوئی بچہ بجانے لگتا اور ایک کتا عین ہماری کھڑکی کے نیچے آ کر بھونکنے لگتا۔ ہم کھڑکی سے اس کتے کو اشتعال دیتے رہتے، یہاں تک کہ وہ تھک جاتا اور اپنی دم پچھلی ٹانگوں کے درمیان دبائے ہوئے واپس چلا جاتا اور ہم فتحیاب سے کھڑکی پر بیٹھے رہتے لیکن جب آسمان پر بنفشی رنگت دوڑنے لگتی تو وہی پر اسرار ہیولے گذرنے لگتے، دھندلے سے، ادورے، سمجھ میں نہ آنے والے۔ کبھی کبھی وہ ہم سے اتنے قریب ہوتے کہ ہم ہاتھ بڑھا کر انہیں چھو سکتے تھے۔

اور ایک دن ایک آدمی کو ہم نے تقریباً بار دک ہی لیا۔ اس نے ایک پرانی، گھسی پٹی پتلون پہن رکھی تھی جس کے رنگ کا تعین کرنا مشکل تھا۔ مگر اس کی ہوائی شرٹ پر رنگ ہی رنگ تھے اور یہ رنگ اس کے بالوں پر بھی تھے اور اس کی آنکھوں میں بھی اور وہ ہماری کھڑکی کے نیچے ہی آ کر رکا تھا اور ہم نے محسوس کیا کہ شراب اور تارپین کے تیل کی تیز مہک اسکے پورے وجود سے آرہی تھی۔

"اچھا، تو اس گھر میں کوئی رہتا بھی ہے؟" اس نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور تم لوگ کبھی باہر سڑک پر کیوں نہیں نکلتے؟ اندر گھٹن محسوس نہیں ہوتی؟"

"ہوتی ہے۔ مگر ماں بہت جلد آجاتی ہے۔" ہم کہتے۔

"ارے ہاں، ماں!" وہ مسکرا کر کہتا۔ "تبھی تو، اور میں سمجھتا تھا کہ... مگر خیر چھوڑو یہ واقعہ۔"

"ہماری ماں لڑکیوں کو سلائی سکھاتی ہے۔" ہم فخر سے کہتے۔

"پیٹ بھرنے کے لئے ہر شخص کو کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔" وہ ایک بیڑی سلگا لیتا اور تب ہم دیکھتے کہ اس کے گالوں پر داڑھی کثرت اور کھردرے پن سے اگ آئی ہے۔ "پیٹ کے آگے خدا کی بھی کیا مجال کے کچھ کہے۔"

"اور تم کیا کرتے ہو؟"

"میں دروازے اور کھڑکیاں رنگتا ہوں۔ کبھی کہو تو تمہاری کھڑکیاں بھی رنگ دوں۔"

"رنگ دو، رنگ دو" نجیب چلا اٹھتا ہے۔

"تمہیں پیسے نہیں چاہیئے کیا؟" میں نجیب کی طرف غصے سے تاکتے ہوئے اس آدمی سے کہتا۔

"سو تو چاہیئے۔ مگر تم دونوں اتنے پیارے بچے ہو کہ میں یہ کام مفت بھی کر سکتا ہوں۔ تم صرف رنگ کا خرچ دے دینا۔"

اور جب وہ بیڑی پیتا ہوا، اپنی رنگدار شرٹ اور بے رنگ پتلون کے ساتھ چلا گیا تو ہم نے تہیہ کر لیا کہ ماں سے کہہ کر کھڑکیاں رنگوالیں گے۔ رات کو تاریک اور سرد پڑتے دیکھ کر ہم نے کھڑکیاں بند کر دیں اور بے چینی سے ماں کا انتظار کرنے لگے کیونکہ ہمیں اپنی کھڑکیاں رنگوانی تھیں۔ ہم دونوں کھلی آنکھوں سے ایک سپنا دیکھ رہے تھے کہ آسمان سرخ ہوا اٹھا ہے اور کھڑکی پر برش پھیرتے پھیرتے یکایک وہ آدمی اپنا چہرا اندر لاتے ہوئے کہتا ہے۔ "دیکھو، دیکھو، کیا خوبصورت لگ رہی ہیں یہ اب

رنگین چڑیاں آئیں گی اور تمہاری کھڑکیوں پر بیٹھ کر چہکا کریں گی۔"

تھوڑی دیر بعد دروازے پر کھڑکھڑاہٹ سن کر یہ خوش خبری سنانے کے لئے ہم اچھل کر ماں کی طرف بھاگے۔ مگر ماں نے ہمیں پرے ڈھکیل دیا۔

"ارے بس۔ تم سب میری انگلیوں کے ٹانکے توڑ دو گے۔"

اور کانپتے دل کے ساتھ ہم نے دیکھا، ماں کے داہنے ہاتھ کی تین درمیانی انگلیوں پر پٹیاں کسی ہوئی تھیں۔

"ماں یہ کیا ہوا؟" ہم سہم گئے۔

"ہونا کیا تھا۔ مشین کھول کر درست کر رہی تھی کہ پائدان پر پاؤں پڑ گیا۔ پرنسپل سے کافی جھگڑا ہوا لیکن میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں اب وہاں کام نہیں کر سکتی۔ کہیں اور کام ڈھونڈنا ہوگا۔"

بہت مشکل سے ہم لوگوں نے لالٹین جلائی۔ اس رات روٹی مجھے بیلنی پڑی اور جب چولہے کا دھواں کمرے میں بھرتا جا رہا تھا تو ماں کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو برس پڑے۔ اس نے ہم دونوں کے سر کو اپنے ملائم سینے سے لگا لیا اور کھڑکی سے باہر آسمان کی طرف تاکتے ہوئے غصے سے چلائی۔

"اور کیا تم یہی چاہتے تھے؟ تم وہاں سے تو سب کچھ دیکھ رہے ہو گے۔ خوب اچھی اچھی چیزیں کھا رہے ہو گے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب کچھ دن پھر ہمیں فاقے کرنے ہوں گے۔"

ہم اپنا چہرا اوپر اٹھاتے ہوئے ماں کے خوبصورت اور صبیح چہرے کی طرف تاک رہے تھے۔ ہماری سمجھ میں اس وقت ہماری ماں نہیں آ رہی تھی۔ لیکن دوسری شام جب ہم کھڑکی کے قریب کھڑے تھے تو یکایک مجیب اپنا سر میرے کندھے پر رکھ کر رونے لگا۔

"بھیا، ماں تو اتنی دیر نہیں کرتی۔ کتنی بھوک لگ رہی ہے۔"

ماں آدھی رات کے بعد واپس لوٹی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کیک اور بسکٹ سے بھرا ہوا ایک پیکٹ تھا۔ ہم دیر تک نیم غنودگی کی حالت میں کیک اور بسکٹ چباتے رہے۔ پھر پانی پی کر ماں کے بستر پر آ گئے۔

ماں پیٹھ کے بل بستر پر لیٹی ہوئی چھپر کو گھور رہی تھی۔ ہماری باہوں کو اپنے گرد محسوس کر کے اس نے ہمیں اپنے جسم سے لپٹا لیا اور اسکا چہرا آنسوؤں میں ڈبڈبا اٹھا۔

"میں جانتی ہوں میں گنہ گار ہوں۔ لیکن میں کیا کرتی۔ آخر میں ایک ماں ہوں۔ تم ماں ہوتے تو سمجھ جاتے۔!"

اس رات دیر تک ہم ماں کا چہرا سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن جانے کیوں اسے کسی مخصوص خانے میں رکھ کر سمجھنا مشکل ہو رہا تھا۔

دوسری شام ہماری کھڑکیوں پر خوش رنگ پھولوں والے پردے لہرا رہے تھے۔ اور ماں آئینہ کے سامنے بیٹھی اپنے بالوں میں برش کر رہی تھی۔

"رات میں دیر سے گھر لوٹوں گی۔" اس نے سر میں مانگ نکالتے ہوئے کہا۔ تم لوگ میرا انتظار نہ کرنا ــــــ ممکن ہے نہ بھی لوٹوں"

●●●●●
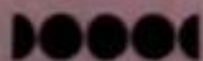
پھاٹک کے باہر

لوہے کے اس زنگ خوردہ پھاٹک کے کنارے ٹھہر کر آپ تصورات کی دنیا میں ڈوب
جاتے ہیں۔

مگر اس میں قصور آپ کا ہے
کوئی وجہ نہیں کہ کتے آپ پر نہ بھونکیں، مگر انہیں اپنی خارش سے کب فرصت ہے نالے
کی سڑاندھ آپ کو واپس آج کی دنیا میں لے آئی ہے۔ مگر اس وارڈ کا کمشنر آپ کے سوالوں سے
حیران و پریشان ہو جانے والی چیز نہیں۔ اور پھر وقت کے خلاف آپ کب تک لڑ سکتے ہیں؟
اس عمارت میں ایک کھڑکی ہے۔ معاف کیجئے، بہت ساری کھڑکیاں ہیں اگر آپ کو اس سے کیا۔
آپ تو اس پھاٹک تک آ کر سب کچھ فراموش کر چکے ہیں۔ آپ اپنے پلے ہوئے کف لنک سے پرے
آنے کی استعداد رکھتے ہوں تو بات دوسری ہے۔ مگر کیا آپ خود کو اپنے سائے سے گھسیٹ کر الگ
کر سکتے ہیں۔ نہیں تو آپ کو اس کے اندر سے اسے ڈاج دے کر نکلنا ہو گا۔ ایک بوڑھا، پکی ہوئی
بھوؤں والا دربان جہاں ہونا چاہیے وہاں نہیں ہے اور آپ پھر بھی اپنا راستہ ڈھونڈ لیتے
ہیں۔ کیونکہ لاکھوں کروڑوں لایعنی چہروں میں سے گذرتے گذرتے آپ نے اپنے لئے جو چہرا منتخب
کیا ہے وہ اس شخص کی غیر موجودگی کے باوجود بھی کسی نہ کسی دروازے کو اپنا فریم منتخب کرنے
کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مگر آپ کے لئے یہ ضروری نہیں کہ آپ اپنے پیروں کو تکلیف دیں۔ گرچہ
یہ آج تک آپ کو جہاں تک لے گئے ہیں وہ آپ کے اپنے وجود کا پھیلاؤ ہی ہے۔ بلکہ آپ اپنی

گردن موڑ کر تاکیں تو آپ کو اپنی ریڑھ کی ہڈی بوڑھے سورج کے نیچے اسپرنگ دار گدے کیطرح کانپتی نظر آئے گی۔ مگر یہ تھرتھراہٹ دراصل آپ کے اندرونی انٹرکام کی پیداوار ہے جس کے بٹن کو مضبوطی سے دبا کر کوئی آپ کے اندر سے آپ کو آواز دے رہا ہے۔ کیا آپ اس آواز کو پہچانتے ہیں

"ہیلو، کیا بکواس ہے، ادھر کوئی ہے کہ نہیں۔ ہا"

"ہیلو، بھئی اگر کوئی نہیں تو ویسا کہہ دو۔"

"ہیلو، مگر کوئی ضرور ہے۔ ورنہ میں یہ بٹن کیوں دباتا۔"

"ہیلو۔ ہیلو۔"

ایک گھر کے اندر مختلف طریقوں سے آیا جا سکتا ہے۔ آپ جو طریقہ اپنانا چاہتے ہیں وہ سوسائٹی کے ان سب سے مہذب طریقوں میں سے ایک ہے جو کسی بھی گھر کا دروازہ کھول سکتے ہیں۔ مگر پھر کیا وجہ ہے کہ آپ اب تک دروازہ کھول نہیں پائے۔ میں آپ کی مدد کروں۔ مگر میرا طریقہ بھی وہی ہے جو آپ کا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں کالنگ بیل استعمال نہیں کرتا، دستک نہیں دیتا اور جب آپ یہ حربے استعمال نہیں کرتے تو دروازے خود بخود کھل جاتے ہیں۔

"خوش آمدید، میں گھر پر نہیں ہوں۔"

"آپ کی تعریف۔ یوں اس کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ میں گھر پر نہیں ہوں۔"

"آپ تشریف رکھ سکتے ہیں۔ مگر کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ میں تو گھر پر نہیں ہوں۔"

تو بات پھر یوں ہے کہ اس زنگ خوردہ پھاٹک سے شروع ہوتی ہے اور نالے کی اس سڑاندھ سے جس نے آپ کے اندر ایک خارش زدہ کتے کا خوف ڈال دیا ہے۔ آپ کا ڈر فطری ہے کیونکہ یہ کتا واقعی اتنا بھوکا ہے کہ آپ کا گوشت چبانے کا خواب وہ جاگتی آنکھوں سے بھی دیکھتا ہوگا۔ گرچہ آپ خود اس طرح کی عادتوں سے محروم نہ ہوں گے۔ مگر آپ نے کچھ نئی عادتیں بھی ڈال لی ہیں۔ اور اب آپ کو اپنے بھوکے دانت ننگے کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ آپ اپنی عینک کا نمبر بدل کر بھی وہی رہتے ہیں جو آپ اس سے پہلے DADAISM کے اسکول کی پینٹنگز کے نیچے کھڑے ہونے کی حالت میں تھے۔ مگر کیا آپ کو یہ بتایا نہیں گیا کہ اس سڑک پر جن درختوں کے ٹھنڈ وہ کھڑے ہیں وہ نیلام کئے جا چکے ہیں۔ "کیا آپ کو ان خشک تنوں میں دریلو کی تابوت نظر نہیں آتی؟" کیا کہیں

حرفِ آدم کی ہتھیلیوں اور پیروں میں ٹھونکی جاتی ہیں، ہاں ایسا بھی ہوتا ہے۔ جب ہرے پتے
آئے بند ہو جاتے ہیں تو انسان کا شرمناک نیلام ناگزیر ہو جاتا ہے۔ کھڑکیوں پر گرتے ہوئے پتھروں
کی طرح جو شخصیت میں دراڑیں ڈال دیتے ہیں، اندرونی ٹھہراؤ کو منتشر کر دیتے ہیں اور پھر ہی کاغذی
پیوند کی گنجائش چھوڑ جاتے ہیں۔ آواز جو تھرتھراتی، لڑکھڑاتی، گھٹنوں پر رینگتی، ایک، دو، تین
کی تکرار پر دم توڑ دیتی ہے۔

"ایک، دو، تین !!!"

لیکن یہ نمبر آغاز کی طرف بھی اشارے کرتے ہیں اور خاتمہ کا اعلان بھی ہیں اور نیلام ہو چکے
انسان کسی زنگ خوردہ پھاٹک تک نہیں آئے کیونکہ تمام پھاٹک اس کے لئے بند ہو جاتے ہیں اور جب
تمام پھاٹک بند ہو جاتے ہیں تو چور دروازے کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ گرچہ یہ چور دروازے بھی اتنی ہی
شرمناک حد تک بے رحم ہیں اور یہ بھی ستاروں تک قدموں کو نہیں لے جاتے بلکہ زیادہ سے زیادہ کسی
گیلے، پتھریلے صحن تک لے جا کر سنسان اور ویران احاطے میں ایک زنگ خوردہ پھاٹک کے روبرو
لا پھینکتے ہیں۔

مگر نہیں — آپ کا اندازہ غلط ہے۔ آپ میرے لئے ORATOR SOAP BOX
کا لفظ استعمال نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہماری سوسائٹی میں بھیڑ سے نکلی ہوئی ہر آواز واپس بھیڑ میں گم
ہو جاتی ہے۔

●●●●●

آکٹوپس

وہ لوگ دکانیں کھول کر اپنے اپنے کاؤنٹر پر بیٹھ گئے۔ سورج تارکول کی سڑک پر قطرہ قطرہ پگھلتا رہا اور وہ کاؤنٹروں پر چپ چاپ بیٹھے دن کو پھیلتے، سمٹتے اور دم توڑتے دیکھتے رہے۔ آج سڑک پر راہگیروں کی بھیڑ کم تھی۔ کتے تک خاموش تھے اور سرکاری گاڑیاں اپنی مغلوب بھنبھناہٹ کے ساتھ آجا رہی تھیں۔ ان میں معمول کے چہرے سجے ہوئے تھے اور ان چہروں کی تختی دن کو اور بھی بے حس بنا رہی تھی۔

تو وہ لوگ اپنے کاؤنٹروں پر بیٹھے رہے اور شام ہو گئی اور بیکار بیٹھے بیٹھے وہ اکتا گئے، اور انھوں نے وقت گذارنے کے لئے بے تکے پن سے سوچنا شروع کر دیا اور وہ لوگ کیوں، کب، کہاں اور کون کی حدود سے پرے نکل کر سوچنے لگے۔ ان کے ہونٹ ساکت تھے مگر ان کے ذہن دوڑ رہے تھے اور ان کے نوکر اپنے اپنے اسٹول پر بیٹھے نیم تاریک رات میں ضم ہو گئے تھے۔

میں جب دکان کے اندر داخل ہوا تو دونوں اسی حالت میں بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر ان کے بیٹھنے کی وضع میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی۔ نوکر اپنی بے چہرگی میں کچھ اور ڈوب گیا اور کاؤنٹر کا آدمی اپنے سوچ کے دائرے میں کچھ اور سمٹ گیا۔

"مجھے اپنی لیبوریٹری کے لئے پرفیومڈ کلورن چاہیے۔ معاف کیجیے۔"

اس نے میری طرف توجہ نہیں دی مگر نوکر اپنے اسٹول سے اٹھ کر کاؤنٹر کے پیچھے غائب ہو گیا

"کیا میں یہ سمجھوں آپ کے اسٹاک میں یہ چیز نہیں ہے؟"

نوکر کاؤنٹر پر دوبارہ دکھائی دیا۔ وہ مسکرا رہا تھا اور میری طرف اشارہ کر رہا تھا۔ یکایک

اس نے جھک کر میرے کان میں سرگوشی کی۔
"کیا سچ مچ آپ کچھ خریدنا چاہتے ہیں۔؟"
"سچ مچ سے تمہارا مطلب کیا ہے؟ میں کیا جواب دوں؟"
"اس لئے کہ بعض اوقات لوگ بے مصرف سے آنکلتے ہیں۔ اس دکان میں صرف وہ چیزیں ملتی ہیں جن کے بارے میں یہ یقین سے کہا جاسکتا ہو کہ خریدنے والا سچ مچ خریدنا چاہتا ہے۔"
باہر گلی میں کسی کے قدموں کی چپ چپ سنائی دی۔ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اوور کوٹ پہنے ہاتھ میں ٹارچ اٹھائے دکان کے اندر داخل ہوا۔ اس کی بھویں اتنی گھنی تھیں کہ پورے چہرے کے خطوط ان بھوؤں کے ارد گرد نفیس پنسل سے ابھارے گئے سے لگ رہے تھے۔ اس نے کاونٹر کے آدمی سے کہا۔
"ایکسکیوزمی۔ ہیئر ڈائی کی سب سے بہترین کوالٹی آپ کے پاس کیا ہے؟"
کاؤنٹر کے آدمی کے چہرے میں خفیف سی حرکت پیدا ہوئی۔ وہ اٹھ کر شیشے کے ان خانوں کی طرف گیا جو مجموعی طور پر دکان کی پشت پر فرش سے چھت تک بیک ڈراپ کا کام دے رہے تھے۔ اس نے بہت سارے ٹیوب نما رنگین ڈبے کاؤنٹر پر ڈھیر کر دئے۔ گاہک سے نپٹنے کے بعد رسید کاٹ کر اس کے حوالے کیا، سارے سامان اٹھا کر بیک ڈراپ کے متعلقہ خانے میں رکھ دئے اور اپنی کرسی پر آبیٹھا۔
اب ایک بار پھر اس کا چہرا دشوار گذار بن گیا تھا۔
"کیا یہاں کچھ تھوڑے سے گاہک پہچانے جاتے ہیں؟" میں نے کاونٹر کے آدمی کو مخاطب کیا۔
گویا اس تک میری آواز پہنچی ہی نہیں اور تو کر اپنے اسٹول پر کچھ اور اوپر ہو کر بیٹھ گیا۔ یہاں تک کہ اس کے بیضوی چہرے پر چیچک کے نشان صاف طور پر نظر آنے لگے۔ اس نے کہا۔
"در اصل یہاں پر آنے والا ہر آدمی گاہک قرار نہیں دیا جاسکتا۔ دکاندار کچھ خاص قسم کے حقوق اپنے پاس محفوظ رکھنے پر مجبور ہیں۔"
"اور ایک آدمی کو پرکھنے کی کسوٹی کیا ہے؟"
یکایک میں حیران رہ گیا۔ در اصل میرے سامنے سے وہ اتنی تیزی سے اٹھ کر چلا گیا تھا کہ مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔ وہ مجھے دکان کے داخلے پر نظر آیا۔ جہاں ایک لڑکی چھینٹ کے شلوار اور کرتے میں ملبوس داخل ہو رہی تھی۔

"خوش آمدید محترمہ۔ ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟" وہ جھکا ہوا کہہ رہا تھا۔ میں نے مڑ کر کاؤنٹر کے آدمی کی طرف تاکا۔ وہ جاگ چکا تھا، اور مجسم توجہ بنا بیٹھا ہوا تھا۔

"مجھے سیفٹی ریزر چاہیئے اور وہی مخصوص لوشن۔"

دکاندار "وہی مخصوص لوشن،" اور سیفٹی ریزر نکالنے کے لیئے بیک ڈراپ کی طرف بھاگا۔

میں نے چاہا کہ اس لڑکی کو اپنی طرف متوجہ کروں، شاید میں نے اس سے کچھ کہا بھی تھا، مگر وہ میری طرف متوجہ نہیں ہوئی۔ اس نے خاموشی سے مطلوبہ سامان خریدے، قیمت چکائی اور دکان سے باہر نکل گئی اور ایک بار پھر نوکر میرے سامنے کاؤنٹر کی دوسری طرف آ بیٹھا تھا اور دکان دار کا چہرا سپاٹ ہو گیا تھا۔

"ہمیں اپنے گاہکوں کے پس منظر سے دلچسپی نہیں ہوتی،" دانشمند نوکر کہہ رہا تھا۔ "گاہک دنیا کے کسی بھی خانے سے آسکتے ہیں، مگر اس کی مملکت دکان کے داخلے پر آ کر ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں سے انہیں اپنے آپ کو پوری طرح ہمارے ہاتھوں سونپنا پڑتا ہے۔"

"اگر میں یہ جان پاتا کہ یہاں کے قوانین کیا ہیں؟"

"یہاں نوشتہ تحریروں پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا ہے۔ گاہکوں کے چہروں سے ان کے لئے قوانین اخذ کئے جاتے ہیں، لیکن ہم اپنی مرضی کے مطابق ان میں رد و بدل بھی کر سکتے ہیں جس کا اختیار صرف ہم کو ہے۔"

اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ اسٹول سے اتر کر، کاؤنٹر کا تختہ اٹھا کر، دکان کے کونے میں، داخلے کے پاس رکھے ہوئے اسٹول پر واپس چلا گیا اور اپنی بے چہرگی میں ڈوب گیا۔ میں نے مڑ کر کاؤنٹر کے کونے پر بیٹھے ہوئے آدمی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرا لکڑی کی طرح قطعی سپاٹ اور کسی بھی قسم کے جذبے سے مبرا تھا۔ پھر میری نظر دکان سے باہر چلی گئی جہاں گلی میں ہلکی ہلکی پھوار کے درمیان وہی لڑکی اپنے لوشن اور سیفٹی ریزر کے ساتھ کھڑی میری طرف ایک ٹک تاک رہی تھی۔ شاید وہ میری منتظر تھی۔ میں اسٹول سے نیچے اتر کر دکان سے باہر چلا آیا۔ میں نے اسکا ہاتھ اپنی ہتھیلی میں لے کر کہا، "تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟"

اس کی آنکھیں پتھر کی آنکھوں کی طرح بے حس بنی مجھ پر مرکوز رہیں، مگر اس کی انگلیوں کی گرفت میری ہتھیلی پر مضبوطی سے قائم ہو گئی۔ پیچھے مڑ کر نظر ڈالے بغیر ہم دونوں گلی میں چلنے لگے۔ چلتے چلتے ایک ویران سڑک پر نکل آئے۔ جس سے نیچے اتر کر گھاس کے ایک میدان میں داخل ہوئے اور کشم کے

ایک وسیع و عریض درخت کے نیچے رکھے ہوئے بینچ پر بیٹھ کر چاند کی روشنی میں ننھی منی بوندوں کو خلاء میں مٹھے کے دانے بکھیرتے دیکھتے رہے۔ قریب واقع ایک کوارٹر کی کھڑکی سے روشنی کا ایک تکون آکر اسکے چہرے کو چومنے لگا اور اسکے پھولے پھولے سرخی مائل گالوں پر بے شمار بوندیں چمک اٹھیں۔ میں نے اپنی انگلیوں کے لمس سے ان بوندوں کو مٹا دیا اور اس کے لپ اسٹک سے عاری ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ کر اس کے اسرار کی تہہ تک پہنچنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ اس نے اپنا چہرا دوسری طرف موڑ کر ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"کیا ضروری ہے کہ ہر رات کا انجام ایک ہی ہو؟"

"میں تمہاری 'ہر رات' کی کہانی میں کوئی رول ادا کرنا نہیں چاہتا۔" میں نے کہا۔ "اب کہ تم نے اپنی خاموشی توڑ دی ہے تو کیا بتا سکتی ہو کہ اس پر اسرار دکان میں گاہکوں کو ناپنے کا پیمانہ کیا ہے۔؟"

"میں نہیں جانتی۔" اس نے کہا۔ "میں نے آج پہلی بار اس دکان سے خریداری کی ہے کل تک یہاں میں نے ایک گھڑی ساز کی دکان دیکھی تھی" اور دن یا رات کے ٹھیک بارہ بجے میں اس دکان کے سامنے آ کھڑی ہوتی تاکہ سینکڑوں گھڑیوں کو ایک ساتھ اپنی مختلف نوع کی آوازوں سے فضا میں ارتعاش ڈالتے سن سکوں۔ کیا کبھی تم نے یہ تجربہ کیا ہے؟ تمہیں ایسا لگے گا جیسے ہندوستان کی تمام گھڑیاں تمہارے کانوں میں بج رہی ہوں، جیسے وقت کی رفتار دفعتاً تھم گئی ہو۔"

"نفسیاتی طور پر میری فطرت میں کوئی ایسی پیچیدہ گرہ نہیں جو مجھے ٹھیک بارہ بجے کسی گھڑی ساز کی دکان میں کھڑی کرے یا پرندوں کے گھونسلوں میں ہاتھ ڈال کر کسی ملائم چیز کی موجودگی کو محسوس کرنے پر مجبور کرے۔ میں جس کالونی میں رہتا ہوں وہاں فینس کے اندر ہاتھ بڑھا کر پھولوں کو چھونے کی قطعی ممانعت نہیں ہے۔"

"اور میں جس کالونی میں رہتی ہوں وہاں پھول ہیں ہی نہیں۔"

یکایک میں نے جھک کر دیکھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ابھی تو وہ ایک ٹین ایجر ہے اور اس نے کرتے کے اندر بریزیر تک نہیں پہنا ہے اور میں اس کے سینے کی نرمی کو ہتھیلی سے محسوس کرتے ہوئے چونک پڑتا ہوں۔ کیا سچ مچ جس کالونی میں وہ رہتی ہے وہاں لوگ یہ نہیں جانتے کہ پھولوں کے کھلنے کا موسم کون سا ہوتا ہے کہ قبل از وقت پھول کو مسل کر نہ تو خوشبو حاصل کی جا سکتی ہے نہ خوبصورتی

کا انمول احساس اور یہ یونش اور یہ سیفٹی رینہ دراصل اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو اس کی ہر رات کی کہانی کو ایک ہی انجام تک لے جاتی ہے۔

"آؤ، میں تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑ آؤں۔"

میں اس کے کندھوں کے گرد اپنا بازو ڈال کر اسے اوپر سڑک تک لے آیا۔ پھوار یکساں طور پر اپنا فرض نبھا رہی تھی۔ اس نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا تھا اور شاید یہ بھول جانے میں مصروف تھی کہ یہ آدمی بھی دراصل اسے واپس اس کے جہنم میں لے جا رہا تھا۔

آدھی رات ہو چکی تھی جب دھیرے دھیرے قدم بھگتے ہوئے سر کو جھکائے میں واپس گھر کی طرف جا رہا تھا۔ گلی میں تقریباً تمام دکانوں کے شٹر گرے ہوئے تھے۔ بہت سارے کتے گیلی زمین پر لیٹے ہوئے تھے کیونکہ اب پھوار دم توڑ چکی تھی۔ انہوں نے میری طرف توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بارش نے غلاظت کے ڈھیروں میں پوشیدہ جرثوموں کو چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں رومال ناک پر رکھ کر آگے بڑھ رہا تھا کہ معاً مجھے یاد آیا، وہ پر اسرار دکان اسی گلی میں کہیں واقع تھی۔

اس خیال کے آتے ہی میرے پاؤں تھم گئے اور میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔

میں اسی مخصوص دکان کے سامنے کھڑا تھا۔

دکان کھلی ہوئی تھی۔ اندر تیز روشنی ہو رہی تھی۔ مگر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں زینہ پھلانگتے ہوئے اندر داخل ہو گیا اور یکایک حیرت و استعجاب سے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

گرچہ پوری دکان وہی تھی۔ مگر اب اس میں چاروں طرف گھڑیاں لٹک رہی تھیں اور دیواروں پر ٹنگی ہوئی ٹک ٹک کر رہی تھیں۔

"ارے کوئی ہے!" میں نے کاؤنٹر کے سامنے رک کر آواز لگائی۔ مجھے کہیں کوئی دکھائی نہ دیا۔ تھوڑی دیر تک میں اسٹول پر بیٹھا رہا اور انتظار کرتا رہا پھر یکایک غصے کی ایک شدید لہر میرے اندر بجلی کی طرح دوڑ گئی اور میں نے پلائی ووڈ کے کاؤنٹر پر ایک زوردار گھونسا عائد کرتے ہوئے کہا۔

"ارے کوئی ہے؟"

گھونسا قدرے زیادہ زور سے پڑا تھا۔ اس کی دھمک سے کاؤنٹر اچھل سا گیا۔ بیک ڈروپ کے خانے، دکان کے اسٹول اور دیواروں سے لٹکتی ہوئی گھڑیاں ڈول سی گئیں اور ایک لمحے کے لئے

مکمل سناٹا چھاگیا۔ ٹک ٹک کی آواز تک غرق ہوگئی تھی۔ میری سانس ٹھہری ہوئی تھی اور کسی چیز کی آمد آمد کے احساس سے میرا رواں رواں کانپ رہا تھا۔

پھر عین میرے سامنے کی گھڑی کے اندر ایک زوردار دھماکہ پیدا ہوا اور میں اچھل پڑا۔ اس آواز کو آدھے راستے پر ایک دوسری آواز نے سہارا دیا، پھر تیسری آواز نے دھیرے دھیرے بہت ساری آوازیں اس بھیڑ میں شامل ہوگئیں، اور دکان کے اندر کان پڑتی آواز تک سنائی دینا بند ہوگئی لیکن ان تمام آوازوں کے باوجود مجھے اپنے دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔

میں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور جاگتا ہوا دکان سے باہر نکل آیا۔ میں اندھادھند گلیوں اور سڑکوں پر بھاگ رہا تھا۔ دھیرے دھیرے سارا شہر ایک گہرے سمندر میں تبدیل ہوگیا جس میں وہ سینکڑوں کرخت آوازیں پوری مستعدی کے ساتھ کسی اکٹوپس کے عضلات کی طرح میرا پیچھا کر رہی تھیں۔

●●●●

کیلیڈوسکوپ

شہر کا طفلانہ، مکروہ چہرا دن کے خوفناک اجالوں سے ٹکرا کر کر چیوں کی طرح ٹوٹتا ہوا جاگ اٹھا۔ وقت کی رفتار سے تیز بھاگتی گرد کھڑکی سے ڈرائنگ روم کے قالین پر کود پڑی۔ اس گرد کا چہرا ایک بوڑھی مغنیہ کا تھا۔ بوڑھی مغنیہ جس نے گرم پانی سے اپنی چقندر جیسی سرخ ناک باہر لاتے ہوئے اداسی سے کہا۔

"میرا نام GUINESS BOOK میں کیوں نہ آیا ؟ کیوں نہ آیا ؟ کیوں نہ آیا۔ ؟"

اس کی آنکھیں پتھرائی تھیں۔ اسکے پستانوں کو وقت نے مسل مسل کر کمر تک لٹکا دیا تھا۔ اور جب اسکے ہم عصر اسکے لمبے پستانوں کا ذکر کرتے تو وہ غرور سے "NO GOD FOR ME.C JESUS" گاتی۔ یا I HAVE SEVEN ABORTION & ONE اسکے ریکارڈ بلیوں کو پسند تھے اور اس کی کتاب "این اناٹامی آف انڈین پوپ سانگس" میں اسکا نام مس برنارڈ تھا۔

مگر اس کی ماں مسٹر برنارڈ نام کے کسی آدمی کو نہیں جانتی تھی۔

یہ آٹھویں دہائی کے شروع کا ذکر ہے جب ساری دنیا دم سادھے تیسری جنگِ عظیم کی منتظر تھی۔

"جب تک یہ جنگ نہیں ہو جاتی۔۔۔" ایک نوجوان طالب علم نے کالج کے کیمپس سے باہر آتے ہوئے اعلان کیا" ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ بلکہ ہم کچھ بھی نہیں ہو سکتے۔ ان مسئلوں کا حل نہ تمہاری LAISSEZ-FAIRE میں ہے نہ ہمارے سرخ جھنڈوں میں۔ ہم دونوں کو کسی بمبار طیارے کا انتظار

کرنا ہوگا۔"

بوڑھی مغنیہ نے اپنے ایک البم کا انتخاب کیا اور ریکارڈ، پلیئر کے ٹرن ٹیبل پر رکھ کر سننے لگی

سڑک پر اپنے کوڑے اوپر سر کو اٹھائے رکھنے کی جدوجہد میں مصروف بھکاری ہائیڈرنٹ سے لگ کر کھڑا تھا۔ بوڑھی مغنیہ نے اسکے بھاری جبڑے پر میٹھی ہوئی سکھیوں کو دیکھا۔ یکایک غصے کی ایک شدید لہر کے ساتھ اس نے ریکارڈ ٹرن ٹیبل سے اٹھا کر قالین پر دے مارا۔

"میرا نام GUINESS BOOK میں کیوں نہ آیا؟ کیوں نہ آیا؟ کیوں نہ آیا؟"

مگر ریکارڈ ٹوٹا نہ تھا۔

طالب علم ہنسنے لگا۔ اس نے اپنی گرل فرینڈ کے اسکرٹ کے اندر ہاتھ دے جا کر اس کی لاعلمی کا فائدہ اٹھالیا تھا۔ لڑکی کا چہرا سرخ ہو رہا تھا۔ لیکن یہ سرخی غازے کی تھی۔ تار کے فینس سے گھرے ہوئے باغ میں ایک کتا مر گیا تھا۔ اسے سڑنے میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔ اس وقت تک عورتیں بالکنیوں میں کپڑے سکھا سکتی ہیں۔ ہاکر PIGEON HOLE میں اخبار کا بل ڈال سکتا ہے۔ ٹرن اسٹائل پر بیٹھ کر چکر لگاتے ہوئے بچوں کو ان کی مائیں بلا سکتی ہیں۔ ر ڈورسٹ بین پر کھڑا سیاہ جھبرا کتا نیچے کود کر ہائیڈرنٹ کے کنارے بیٹھی ایک کتیا پر قبضہ جما سکتا ہے۔

مگر کتیا اپنے سفلس زدہ جسم اور لنگڑی ٹانگ کے ساتھ بھاگ نکلتی ہے۔

برلن وال کے واچ ٹاور پر بیٹھا جرمن سنتری اپنی دوربین سے کہیں دور تاک رہا ہے۔

"کوئی نہیں ہے" وہ اداسی سے کہتا ہے "اب کوئی ان دیواروں کو پھلانگنے کی کوشش نہیں کرتا۔ کسی کو کسی کی ضرورت نہیں۔"

بھکاری سڑک پار بار کے شیشے کی دیوار کے اندر تاک رہا ہے۔ اونچے اونچے درختوں کے نیچے شام ہو رہی ہے۔ اونچی اونچی عمارتوں کے اندر رات ہو رہی ہے۔ لیکن پیچھے کی گلیوں میں دن کبھی نہیں اترتا ان میں ڈیرا ڈالے ہوئے ریفوجیوں کو روشنی جرنلسٹوں کے کیمروں کے فلش بلب کی صورت میں نصیب ہوتی ہے یا اس وقت جب پولس کسی مجرم کی تلاش میں رات کے اندھیرے میں آ نکلتی ہے۔

"وہ لوگ ہماری لڑکیوں کو اٹھائے جاتے ہیں" ایک ریفیوجی کہہ رہا ہے۔

"تم اس ملک کے باشندے نہیں ہو۔ ہم تمہارا کیس فائل نہیں کر سکتے۔"

"وہ لوگ صبح انہیں واپس ڈال جاتے ہیں۔"

"تم لوگ خوش نصیب ہو۔ کچھ لڑکیاں کبھی واپس نہیں آتیں۔" وہ بے رحم نہیں ہے لیکن وہ جو کچھ ہے اس سے پرے نہیں جا سکتا۔ "واپس چلو۔ جیسے یہ لڑکیوں کو جسم فروشی پر مجبور نہیں کرتے۔ تو کہاں سے پیٹ بھرتے ہیں یہ؟"

بھکاری مشکل سے پلٹ کر مسکراتا ہے۔

"رات ہو گئی ہے پروفیسر" وہ کہتا ہے۔

"ہاں۔" پروفیسر کا ننھا سا جسم اسکی گھنی داڑھی کے اردگرد جھول رہا ہے۔

"رات ایسے ہو گئی ہے جیسے اس کا ہونا کوئی بڑا دھماکہ نہیں۔"

"رات ہمیشہ سے ہوتی رہی ہے۔ لیکن ہم کبھی انہیں سمجھ نہ سکے" پروفیسر بھکاری کو ایک سکہ دیتا ہے

"میں بھکاری نہیں ہوں پروفیسر" کبڑا بھکاری سکے کو بوڑھی انگلی اور شہادت کی انگلی کے درمیان رکھ کر دیکھتا ہے "اس میں کنگ جارج پنجم کی تصویر کیوں نہیں؟ اوہ مجھے یاد آیا۔ بوڑھے جارج کا کوئی کوبڑ نہ تھا ورنہ اسے اسکے اندر اپنے نہ ہونے پر میری طرح حیرت ہوتی۔ رات کے پیالے میں ایک سکہ بھی ہو سکتا ہے مجھے معلوم نہ تھا۔"

"رات کے پیالے میں زہر کے سوا کچھ نہیں" پروفیسر آگے بڑھنا چاہتا ہے۔

"اس سکے میں مجھے ایک پیالہ زہر مل سکتا ہے پروفیسر؟"

پروفیسر سکے کو الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے۔ واپس دے دیتا ہے۔

"اوں ہوں، یہ نہیں چل سکتا۔ جعلی ہے۔"

"تب تو ایک پیالہ زہر ضرور مل سکتا ہے۔"

"ہاں۔"

دونوں ایک ساتھ بار کے اندر قدم رکھتے ہیں۔ بار مین اپنے . . دانت کے سوراخوں سے ہنستا ہے۔ منہ میں سونا چمک رہا ہے۔

"مگر یہ بھکاری پروفیسر!"

"میں بھکاری نہیں ہوں" کبڑا بھکاری ایک اسٹول پر جم جاتا ہے اور سکہ کاؤنٹر پر رکھ کر

شکل سے سر موڑ کر پروفیسر کی طرف تاکتا ہے۔ لیکن اب اس کا سر اونٹ کا ہے۔

"ارے، اس سکّے میں تو کنگ جارج کی تصویر ہے۔"

بارمین کے دانت کے سوراخوں سے سارا سونا پھسل کر سکّے پر گرنے لگتا ہے۔

واچ ٹاور پر چکر لگاتے لگاتے سرچ لائٹ ایک قبرستان کے داخلے پر ساکت ہو جاتی ہے۔

"لگتا ہے کوئی ہے" جرمن سنتری اپنی رائفل سنبھال کر دوربین کے اندر سے تاکتا ہے۔ قبرستان سے کچھ دور دھند کی چادر میں ایک عورت چل رہی ہے۔ اسکے ہاتھ میں پھول کی ڈلیا ہے۔ جسے وہ ایک قبر کے سرہانے رکھ کر اپنے سپاٹ سینے پر کراس کا نشان بناتی ہے۔

سنتری دوسری طرف تاکنے لگتا ہے۔

رائفل حفاظتی ریلنگ سے لگ جاتی ہے۔

دوربین سینے سے لٹک جاتی ہے۔

یو این او میں کوئی ہنگامہ نہیں ہوتا۔

کہ ماں کے پیار کا کوئی اسکول نہیں ہوتا۔

لیکن سنتری کے فرض کا ایک مذہب ہوتا ہے

"مجھے یاد ہے" سنتری اپنے ساتھی سے کہتا ہے "وہ دیوار پھلانگتے ہوئے بجلی کے جھٹکے سے گر کر مارا گیا تھا۔ یہ اس کی ماں ہو گی۔"

"حیرت ہے۔ دوسری جنگِ عظیم سے پہلے بھی مائیں ہوا کرتی تھیں۔"

"ہاں۔ اس میں کنگ جارج کی تصویر ہے" بارمین کہتا ہے "میں اس کے اندر ایک سوراخ بنا کر اس کا لاکٹ بنا لوں گا اور اپنی اینگلو انڈین رکھیل کو دوں گا۔"

"پروفیسر" اسٹول پر بیٹھا ہوا اونٹ ہنستا ہے۔ "مجھے تو رم سے متلی آتی ہے۔ مگر آپ کیا لیں گے؟"

"بیئر۔ پروفیسر بیئر کے علاوہ اور کچھ نہیں پیتے" بارمین سکّے سے سر اٹھا کر کہتا ہے۔

"ایک بوتل جم خانہ" پروفیسر اپنے باریک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہتا ہے۔

"ایک پیگ رم، مجھے برانڈ سے مطلب نہیں" اونٹ کہتا ہے "پروفیسر کیا ہم سیاست

پر گفتگو کر سکتے ہیں۔؟"

"نہیں، یہاں اس کی ممانعت ہے۔" بارمین دیوار کی طرف اشارا کرتا ہے۔ جہاں ایک ننگی عورت کی تصویر چسپاں ہے۔ "یہ ننگی عورت ان لوگوں کے لئے ہے جو اس طرح کی بکواس نہیں کرتے۔"

ننگی عورت دیوار سے مسکراتی ہے اور اتر کر انکے درمیان چلی آتی ہے۔

"میرا نام آشیہ ہے۔ یہ نام مجھے پسند نہیں۔"

پروفیسر ہنسنے لگتا ہے۔

"تم ننگی ہو کر بھی ننگی نہیں لگتی، کیونکہ تمہیں اپنا نام پسند نہیں۔" یکایک وہ آگے کی طرف جھک کر بارمین سے کہتا ہے، "یہ عورت کس پارٹی سے تعلق رکھتی ہے۔؟"

"ابھی میں نے فیصلہ نہیں کیا ہے۔" عورت کہتی ہے۔

"کہ ان لوگوں نے مجھ سے یہ حق چھین لیا ہے۔" اوٹ کہتا ہے۔

"کیونکہ میں نے کبھی اپنے ووٹ کا استعمال نہیں کیا ہے۔" بارمین کہتا ہے۔

"یہ ایسا ہے جیسے بیوی کے ہوتے ہوئے کوئی اس کے ساتھ مباشرت نہ کرے۔"

پروفیسر گلاس میں بیئر انڈیلتا ہے اور ابلتی ہوئی جھاگ کی طرف خوفزدہ آنکھوں سے تاکتا ہے۔

"لیکن میں اپنی شراب کیسے پیوں؟" اوٹ کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔

وہ لوگ کیڑوں کی طرح کلبلاتے ہوئے ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں۔ وہ لوگ کہ تاریخ کے اندھے دور میں ان گلیوں میں ڈھکیل دیے گئے ہیں۔

"لیکن اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟" ایک فالج زدہ بوڑھا اپنی سوکھی ٹانگ پر ہاتھ رکھ کر پوچھتا ہے۔ "آخر ہماری کشتیوں کو کہیں رکنا تھی۔ ہم کہاں جاتے؟ ہم دریا تو ہیں کہ سمندر سے جا ملیں؟"

"تو تمہارا خیال ہے جہاں تمہارے قدم پڑیں وہ زمین تمہاری ہے؟" دیوار پر چپکائے گئے سلوگن چیختے ہیں۔ "تم غیر ملکی ہو، غیر ملکی، غیر ملکی، غیر ملکی۔"

"لیکن ہمارے سینے میں بھی ایک دل دھڑکتا ہے۔" ایک عورت کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ "

"ہمارے بچے بھی سورج کی طرف تاکتے ہیں۔"

"لیکن یہ سورج تمہارا نہیں،" سلوگن چیختا ہے۔ "تم اس نظام شمسی کے نہیں۔ تم کسی دوسرے نظام سے آئے ہو۔"

"کیا کبھی تم نے سمندر پار سے آنے والے پرندوں سے کہا ہے کہ تم غیر ملکی ہو؟" ایک ادھیڑ عمر کا مریض کراہتا ہے۔ "کیا جاڑے میں جو پھول اگتے ہیں تم ان کے شناخت کارڈ دیکھتے ہو؟"

"غیر ملکی، غیر ملکی، غیر ملکی،" سلوگن تھک کر رونے لگتا ہے۔ "یہ دیواریں گر جائیں گی مگر میں اسی طرح خلاء میں معلق رہ جاؤں گا۔"

"میری بیٹی لوٹ آئی ہے۔ میری بیٹی لوٹ آئی ہے۔" ایک عورت چیخ رہی ہے۔ سلوگن تلملا کر زمین پر گر پڑتا ہے۔ بہت سارے قدم اسے روند کر گذر جاتے ہیں۔

عورت ایک بندریا سے لپٹی رو رہی ہے۔

"ماں،" بندریا کہہ رہی ہے۔ "مجھ پر زیادہ بوجھ مت ڈالو۔ میرے پیٹ میں بچہ ہے۔ چھ آدمی کا بچہ۔"

اور وہ گلی کے ایک کونے میں چھپ کر ایک مردہ بچہ کو جنم دیتی ہے۔

اس نے بچے کو مار ڈالا،" ٹوٹا پھوٹا سلوگن زمین سے سر اٹھا کر کراہتا ہے۔

"اسے ایک اچھا سا نام دیا جائے۔"

"یہ بچہ مجھے دے دو،" سلوگن چیختا ہے۔ "یہ ہمارا بچہ ہے، ہمارے نظام کا دیا ہوا۔ اس پر ہمارا حق ہے۔ ہم اسے میوزیم میں رکھینگے۔"

بندریا بچے کو بھول کر ایک کھڑکی سے لٹک جاتی ہے۔ جس پر گلاب کے پھولوں کے ٹب قطار سے رکھے ہیں۔

"ماں جی!" وہ کھڑکی کا شیشہ تھپتھپاتی ہے۔ کواڑ کھل جاتے ہیں۔ ایک عورت بالوں پر کنگھی چلاتے ہوئے اس کی طرف تاک رہی ہے۔

"ماں جی، میرا بچہ مر گیا ہے،" بندریا کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ "مجھے ایک نام کی بھیک دیدیجئے"

"مگر میرا بچہ زندہ ہے،" عورت کنگھی سے بال کا گچھا الگ کر کے اس کا ایک گولا بناتی ہے اور اس پر تھوک کر اسے گلی میں پھینک دیتی ہے۔ "کوئی دوسرا دروازہ دیکھو۔"

"ماں جی۔ مجھے گلاب کا ایک پھول ہی دے دیجئے۔ میں اپنے بچے کی قبر پر رکھونگی۔"

"یہ پھول نقلی ہیں" عورت اپنے نقلی بال پرسے اتار کر ہنستی ہے۔ اسکے دانت بے انتہا روشن ہیں جنھیں اتار کر وہ پوپلے منہ سے کہتی ہے "اور میرا بچہ بھی نقلی ہے"

"لیکن کوئی مجھے زمین سے کیوں نہیں اٹھاتا؟" سلوگن کراہتا ہے۔

"جب گولی چلے گی تو تم خود بخود دیوار تک پہنچ جاؤ گے" ایک شخص اس کے اوپر ٹھہر کر کہتا ہے

"جانے کب گولی چلے گی!" سلوگن کی اندھی آنکھوں میں آنسو ہیں۔

لڑکی اپنے ننگے جسم کے نیچے ٹھنڈی ریت کو محسوس کر کے جاگ اٹھتی ہے۔

سمندر کہیں نہیں ہے۔ آسمان کو کسی نے ایک اندھے کنوئیں میں بند کر دیا ہے۔ ناریل کے درخت، لڑکی کی ٹانگوں کے درمیان اگ رہے ہیں، ستاروں کی گرفت سے آزاد ہونے کے لئے بے چین ہیں، کوئی ریت پر ایک انسانی ڈھانچے کو گھسیٹ کر جا چکا ہے۔ ساحل میں گڑی ہوئی ایک تنہا موم بتی کسی صبح کو ظاہر نہیں کرتی۔

"تم بہت خوبصورت ہو تم سے بھی زیادہ"

کوئی کہیں نہیں ہے۔

لڑکی اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے اور اپنے گھٹنوں کے گرد اپنی بانہوں کو لپیٹ کر ہنستی ہے

"یہ تم اس لئے کہہ رہے ہو کیونکہ تم مجھے نہیں جانتے"

"شاید، مگر اس کی ضرورت کیا ہے؟ میں تمہیں جانے بغیر بھی تمہیں گڈ مڈ کر سکتا ہوں"

"سلولائڈ کی ایجاد کے ساتھ ادب دم توڑ چکا ہے" بوڑھا فرانسیسی ادیب مشہور و معروف کیفے میں بیٹھا اپنے ساتھی سے کہہ رہا ہے۔ وہ پچھلے تیس سال سے ٹی ایس ایلیٹ پر لکھتا آ رہا ہے۔ مگر ایلیٹ کے معاملے میں اب بھی وہیں پر ہے جہاں تیس سال پہلے تھا۔ "اب ہمیں ادب پر فاتحہ پڑھ ڈالنا چاہیئے۔ ایلیٹ مردہ باد! بیکٹ مردہ باد!

"اور مارچی ڈیلسائی زندہ باد!" اس کا ساتھی کہتا ہے۔ وہ ہم جنسی کا مریض ہے اور اس سے فرار حاصل کرنے کے لئے اس نے سگریٹ کے خلاف مظاہرہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ "اور ماریو پوزو زندہ باد بونی ایم زندہ باد، اسکن ہیڈس زندہ باد، کو کلکس کلان زندہ باد، آیت اللہ خمینی زندہ باد، مینا حیم بیگن زندہ باد اور ساؤتھ افریقہ زندہ باد"

"شٹ اپ یو باسٹرڈ!" ادیب میز پر ہاتھ پٹک کر چلاتا ہے اور سامنے کی طرف جھک کر اپنی سرخ آنکھوں سے تاکتا ہے۔ "میں... میں تمہیں انکار کرتا ہوں، رد کرتا ہوں، منسوخ کرتا ہوں۔ میں تمہیں نہیں جانتا، نہیں جانتا، نہیں جانتا۔"

مس برنارڈ پوڈل کی گردن پر زنجیر ڈال کر سڑک پر چل رہی ہے۔ اس کے دن روشن ہے اور آسمان سے وزیر اعظم کے طیارے کے گذرنے کا امکان ہے۔ مس برنارڈ نے اپنے بال ہمیٹ کر ایک گھونسلے کی طرح سر پر باندھ لیا ہے۔ مس برنارڈ اپنے پرس کے اندر سے بسکٹ نکال کر پوڈل کو کھلاتی ہے اور پوڈل جب ریح خارج کرتا ہے تو کھلاہٹ سے اس کی تھوتھنی دباتی ہے۔

"تم میری کالی راتوں کے شریک۔ ایک دن میں تمہیں پانی میں ڈبو کر مار ڈالوں گی، اور تمہاری روح میوزیم کی راہداریوں میں بھٹکتی پھرے گی۔"

یکایک وہ اپنا پوڈل زمین سے اٹھا کر ایک گذرتی ہوئی ٹرام کے سامنے پھینک دیتی ہے۔

ٹرام پوڈل کو دو حصے میں منقسم کر کے آدھے راستے پر رک جاتی ہے۔

دو طالبات آٹوگراف بک کے ساتھ اس کی طرف لپکتی ہیں۔

"مس برنارڈ، پلیز یور آٹوگراف!"

"میں آٹوگراف نہیں دیتی۔"

"مگر ڈبونیر کے انٹرویو میں تو آپ نے..."

"میں نے ڈبونیر پر مقدمہ دائر کر دیا ہے۔"

اور مس برنارڈ چینی جوتے سازوں کی دکانوں کے سامنے سے گذرتے گذرتے ٹھہر جاتی ہے ایک بوڑھا چینی اپنے چہرے پر اگے ہوئے تل کے اکلوتے، سفید بال کو آئینے میں تاکتے ہوئے پیار سے کھینچ رہا ہے۔ یکایک وہ اپنا چہرا موڑ کر دیکھتا ہے۔

اور حیران و پریشان سا کھڑا رہ جاتا ہے۔

کیونکہ ایک حاملہ بکری اس جگہ کھڑی ہے جہاں مس برنارڈ کو اس نے آئینے میں کھڑا دیکھا تھا ـــــ

"ایکسکیوز می..." حاملہ بکری شیشے کے شوکیس پر اپنی تھوتھنی رکھ کر کہتی ہے۔ "کیا یہ

چونگ شن کی دکان ہے؟ اگر ہے تو میرے جوتوں کا کیا ہوا؟ یہ مجھے جلد دے دئے جائیں۔ ہمیں ابارشن کے لئے ڈاکٹر گولڈون کا مطلب جانا ہے۔"

ڈاکٹر گولڈون دیر تک با آواز بلند ہنستا رہا۔ پھر اس نے سنجیدگی سے نلکی کے اندر تاکا جسے اس نے داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے اوپر اٹھا رکھی تھی۔

"کسی کو یقین نہیں آسکتا کہ اس کے اندر جو کیڑے کلبلا رہے ہیں وہ پوری نسلِ آدم کو تقریباً تین بار تباہ کر سکتے ہیں۔"

"یہ آپ کن کیڑوں کا ذکر کر رہے ہیں ڈاکٹر؟" اسکا اسسٹنٹ انجی ٹمن نماناک سے کہتا ہے۔

ڈاکٹر گولڈون حقارت سے آنکھیں نیچی کر کے اس کی طرف تاکتا ہے۔

"ان کیڑوں کا جو نسلِ آدم کو تقریباً تین بار ہلاک کر سکتے ہیں۔"

"آہ میں سمجھ گیا،" ٹمن نماناک پھول اور پچک رہی تھی۔ "ضرور آپ کرامزم کا ذکر کر رہے ہیں۔ ٹی وی پر میں آپ کی تقریر POPULATION BOMB سن چکا ہوں۔"

"نہیں، میں ان کیڑوں کا ذکر کر رہا ہوں جو نسلِ آدم کو تین بار غارت کر سکتے ہیں۔ اگر تم نے اپنے دماغ کے بارہ ارب خلیوں کو کام میں لگایا تو ممکن ہے تم ان کیڑوں کی خوراک سے بچ پاؤ۔"

"آہ ڈاکٹر، ذرا اپنا زیر بند کر لیجئے۔ ابھی مس سارا آجائے گی تو سمجھے گی آپ کے چرچ جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ آپ جانتے ہیں مس سارا کی آئی کیو (I.Q.) ایک سو چالیس سے اوپر ہے۔"

"بس بس، مجھے مت چھونا۔" سر تا پا برہنہ لڑکی سمندر کے کنارے بھاگ رہی ہے۔ "میں نے پاپا سے وعدہ کیا ہے اور میرے پردۂ بکارت تک پہنچنے کے لئے تمہیں چرچ کے اندر سے آنا ہوگا۔"

"بکواس بند کرو۔" لڑکا رک کر ایک سگریٹ سلگاتا ہے۔ پھر بے کراں سمندر کی طرف خود اعتمادی سے تاکتا ہے۔ "مگر سارا تم مجھ سے کب تک بھاگو گی۔ یہ سمندر تمہیں پناہ نہیں دے گا۔ یہ تمہیں واپس میری طرف ڈھکیل دیگا، لاش کی صورت میں بھی کیونکہ تم جانتی ہو پانی کے سالموں میں انٹر مولیکیولر کشش کا بری طرح فقدان ہوتا ہے۔"

لڑکی گیلی ریت پر رک گئی ہے۔ یکایک وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گر کر چہرا ہتھیلیوں کے درمیان چھپا لیتی ہے۔

"میں بچپن سے چرچ میں جلتی ہوئی موم بتیوں کا خواب دیکھتی آئی ہوں۔ میں نے خواب میں سمندر کے کنارے خشک ریت پر خون کے کچھ قطرے دیکھے ہیں اور نمکین پانی سے ابھرا ہوا ایک ہاتھ جو بلا جھجک میری کوکھ کے اندر چلا گیا ہے اور اس نے وہاں ایک بیج رکھ دیا ہے جو میرے اندر ہی اندر ایک ننھی سا پودا اور پھر ایک تناور درخت بن کر میری آنکھوں اور کانوں سے اپنی شاخوں کو باہر نکال رہا ہے اور جس نے میری ٹانگوں کے درمیان سے اپنی جڑیں زمین کے اندر پھینک دی ہیں۔ اب میں ایک قدم چل نہیں سکتی۔ دنیا کا بڑا سے بڑا سرجن میرے اندر کے اس پیڑ کو کھرچ کر نکال نہیں سکتا، وہ بھی نہیں جو اس بیج کا مالک ہے۔"

"نہیں۔" لڑکا خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹنے لگتا ہے۔ "میں اس بیج کا مالک نہیں ہو سکتا۔ میں تو اتنا عظیم انسان نہیں۔ میں تو ایک معمولی سا طالبِ علم ہوں۔ جس نے چکلے میں ایک رات گذارنے کے لئے اپنی کتابیں ایک چوتھائی قیمت پر بیچ ڈالی ہیں۔"

"ٹٹ۔۔ ٹٹ۔۔ ٹرٹ۔"

سنتری نے ٹریگر دبا دیا ہے۔ شام کی نیلی روشنی میں آگ کی لکیریں ایک پل کے لئے جاگ کر فنا ہو گئی ہیں۔ واچ ٹاور خاموش ہے۔ نیچے گیلے کھیتوں سے پرے قبرستان میں کوئی قبر پر گری ہوئی سسک رہی ہے۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" دوسرا سنتری مڑ کر حقارت سے تاکتا ہے اور دوربین اسکے ہاتھ سے چھوٹ کر سینے سے لٹک جاتی ہے۔ "اگر وہ زندہ بچ گئی تو معلوم ہے وہ کہاں بھیج دی جائے گی؟"

"گلاگ؟"

"نہیں۔ اب انٹرنیشنل کمیونزم کا تصور دم توڑ چکا ہے۔ اب ہر ملک کے پاس اس کا اپنا گلاگ ہے۔ یہاں تک کہ امریکہ کے پاس بھی اس کا اپنا گلاگ ہے اور امریکہ دنیا کا سب سے بڑا کمیونسٹ نیشن ہے۔ کیا تم نے امریکن ویزا دیکھی ہے جہاں تم سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ کیا آپ کمیونسٹ ہیں؟"

"بیچاری ماں۔" سنتری اپنے ساتھی کے سوال کو نظر انداز کر کے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتا ہے۔ "اب وہ کہیں بھی جائے اپنے بیٹے سے ایک پل کے لئے بھی دور نہیں جائے گی۔"

اونٹ اسٹول پر بیٹھا نہیں رہا ہے اور پروفیسر کی طرف تاک رہا ہے جو بیئر کے نشے میں نڈھال سا اپنی کرسی پر پڑا ہے۔

"پروفیسر، غور سے سنو میں تمہیں ایک کہانی سناتا ہوں۔" اونٹ کہتا ہے۔ "بہت دنوں پہلے کی بات ہے جب خدا کے پاس کرنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔۔۔"

"اس بار میں کہانی سنانے کے لئے بالکل جگہ نہیں ہے۔" بارمین چلاتا ہے۔ "یہ جارج پنجم کی کہانی بھی نہیں۔"

"تو میں ایک گیت گا رہا ہوں، اپنے پروفیسر کے لئے "NO GOD FOR ME, O JESUS"

"بالکل نہیں۔ ہم نے مس برنارڈ سے وعدہ کیا ہے کہ ہم اس کی اجازت نہیں دیں گے۔"

"تو میں اسے بتاؤں گا کہ دنیا کی دو عظیم طاقتوں کو اپنا جنگی سامان بھیجنے کے لئے برلن وال کا ہونا کتنا ضروری ہے۔"

"چپ رہو۔ ورنہ ابھی کہیں سے کوئی گولی آکر تمہارے بھیجے کے پرخچے اڑا دے گی۔"

"تو میں کیا کروں؟" اونٹ بے بسی سے ہنہناتا ہے۔

"تم کہانی سنا سکتے ہو، مگر ریگستان کے تپتے فاصلوں کا۔ تم گیت گا سکتے ہو، مگر ببول کے پیڑ کا۔ تم برلن وال کا ذکر کر سکتے ہو، مگر اتنی مدھم آواز میں کہ صرف تم سن سکو۔ یا وہ جن کی لاشوں پر یہ دیوار بنائی گئی ہے۔"

یکایک پروفیسر چونک کر جاگ اٹھتا ہے اور اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے چاروں طرف تکنے لگتا ہے۔ پھر وہ بارمین کی طرف لپکتا ہے۔

"سنو! تم نے میرا اونٹ دیکھا ہے؟"

"ہم کسی اونٹ کو نہیں جانتے۔"

"تم نے دیکھا ہے وہ اونٹ۔" وہ ننگی عورت کی تصویر کے سامنے رک کر اس سے دریافت کرتا ہے۔

"دیکھا ہے۔ وہ تھوڑی دیر پہلے خفیہ پولس کے ذریعے اٹھا لیا گیا ہے۔ اب تک اس کے گوشت مذبح خانے میں بھیجے جا رہے ہوں گے۔"

"لیکن تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟" بوڑھا فرانسیسی ادیب مشہور و معروف کافی ہاؤس میں بیٹھا اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔ "میں دنیا کا سب سے عظیم ادیب ہوں کیونکہ میں نے کوئی

کتاب نہیں لکھی ہے۔ میں دنیا کا سب سے بڑا نقاد ہوں، کیونکہ میں کتابیں نہیں پڑھتا۔ ادب کی تمام نئی تحریکیں میرے نام سے وابستہ ہیں کیونکہ میں نے کسی تحریک کی بنیاد نہیں ڈالی ہے۔ میں ہی وہ تنہا شخص ہوں جس نے ادب کے عالمی سیمینار میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ ادب کے پاس بھی کولہے ہوتے ہیں۔ اور جب میری بیوی نے میرا پہلا اور آخری بچہ پیدا کرنے سے انکار کر دیا تھا تو میں وہ پہلا شخص ہوں جس نے اس کے اباڑشن کی پوری ذمہ داری اپنے سر لی تھی اور ٹی وی پر اسے ٹیلی کاسٹ کرنے کی پوری رائلٹی ایک چیریٹیبل ٹرسٹ کے حوالے کر دی تھی جو LESBIANS: کے کاز کی حفاظت کے لئے عالم وجود میں آیا تھا۔"

"ادیب کی بیوی زندہ باد!" اسکا ساتھی کہتا ہے۔ "ادیب کی بیوی کا اباڑشن زندہ باد۔ ادیب کے کولہے زندہ باد اور ہر وہ چیز زندہ باد جو ادیب کی منافی کرتی ہو۔"

"شٹ اپ یو باسٹرڈ" ادیب میز پر ہاتھ پٹک کر چلاتا ہے۔ اور سامنے کی طرف جھک کر اپنی سرخ آنکھوں سے تاکتا ہے "میں... میں تمہیں انکار کرتا ہوں۔ رد کرتا ہوں، منسوخ کرتا ہوں میں تمہیں نہیں جانتا، نہیں جانتا، نہیں جانتا۔"

"بکری کا گوشت!"

"سور کا گوشت!"

"گائے کا گوشت!"

خون کی بو سے مذبح مہک رہا ہے۔ لوگ تھیلیاں اٹھائے مختلف پوائنٹس پر بھیڑ لگا رہے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جنھیں تازہ گوشت خریدنا ہے اور جو اپنی ننگی آنکھوں سے جانوروں کو مذبح میں کٹتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔

"اونٹ کا گوشت!"

یکایک گاہکوں میں خوف کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ تمام آنکھیں اس جانب اٹھ جاتی ہیں جہاں ایک اونٹ کا کٹا ہوا سر پلاسٹک کی رسی سے لٹک رہا ہے اور اس کے نیچے ایک آدمی سر پر تنکوں کا ہیٹ لگائے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھامے، چلا رہا ہے۔

"اونٹ کا گوشت! اونٹ کا گوشت! پہلی بار شہر میں اونٹ کا گوشت!!!"

دفعتاً لوگ تھیلیاں پھینک پھینک کر بھاگنا شروع کر دیتے ہیں۔ گوشت بیچنے والا حیران حیران سا، بوتل کے دہانے کو ناک تک اٹھائے ہوئے، بے شمار کولھوں کو داخلے پر غائب ہوتے دیکھ رہا ہے۔ پھر وہ مڑ کر اوپر اونٹ کے سر کی طرف تاکتا ہے

اور بوتل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر جا گرتی ہے۔

اوپر رسی سے ایک انسان کا کٹا ہوا سر جھول رہا ہے۔

●●●●●

آخری چھاؤں

وہ دونوں تارکول کی سڑک کے کنارے ساگوان کے ایک پرانے درخت کے نیچے لیٹے ہوئے سامنے
ہاڑ کی طرف تاک رہے تھے جو دوسری طرف سے ڈائنامائٹ سے تقریباً نصف اڑا دیا گیا تھا۔ فولاد کے
رخانے کا کتھئی مائل دھواں پہاڑ کے اس پار چمنیوں سے نکل نکل کر دھیرے دھیرے آسمان کے نیلے پن
یں گھلتا جا رہا تھا۔ ان کی سائکلیں تھوڑے فاصلے پر ایک دوسرے سے ٹیک لگائے کھڑی تھیں۔ اس
قت جب کہ دوپہر کا خاتمہ ہو چکا تھا نہ سڑک پر کوئی نظر آ رہا تھا نہ دھان کے کھیتوں میں۔ صرف میدان
یں، گھاٹی کی اٹھان پر، ایک گڈس ٹرین کے گذرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

اوورسیئر جگجیت، جس نے اپنا داہنا کان زمین سے لگا رکھا تھا، سر اٹھا کر کپور کی طرف دیکھا جو
یک ٹانگ پھیلائے، ایک ٹانگ اپنے کولھوں کے نیچے موڑے، سگریٹ پھونک رہا تھا۔ جاڑا گذر چکا تھا،
مگر گرمی ابھی اچھی طرح سے آئی نہ تھی۔ جانے کیوں پھر بھی کپور کے چہرے پر پسینے جم رہے تھے۔

دونوں اتوار کی چھٹی منانے سائکل اٹھا کر اسٹیل سیٹی سے باہر نکل پڑے تھے اور شہر تک چلے
گئے تھے جہاں انھوں نے ایک پولش فلم "کاموفلاج" دیکھی تھی اور دن کا کھانا کھایا تھا۔ ان کا ارادہ
شام سے پہلے گھر لوٹنے کا نہ تھا اسی لئے دونوں بے کار پڑے وقت کاٹ رہے تھے۔

"کپور، تم اس سے انکار کر سکتے ہو، مگر ..." جگجیت نے تھوڑی دیر قبل ٹوٹ چکے موضوع کو
از سرِ نو زندہ کرتے ہوئے کہا، "... آج کی تہذیب جو زرعی اور صنعتی ہندوستان میں اور اس کے فیشن
گھروں میں پرورش پا رہی ہے، ہمارے ہندوستانی کیرکٹر کی ترجمانی نہیں کرتی۔ ہمیں کھوئی ہوئی عظمت

حاصل کرنے کے لئے ایک بار پھر دورِ بربریت میں واپس لوٹ جانا چاہیئے۔ شاید اس میں ہماری نجات ہو۔"

"واہیات جگجیت، تم ایسی چیزوں کا ذکر کر رہے ہو جو ناممکن ہیں۔" کپور نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ وہ ایک سی حالت میں بیٹھا ہوا دور آسمان میں تاک رہا تھا۔ "ایسا لگتا ہے تم ایک بار پھر ہندوستان کو غلامی کو زنجیروں میں دیکھنا چاہتے ہو۔"

"غلامی ... ہونہہ ... آخر تیس سال کی آزادی سے ہم کو کیا ملا ہے۔" جگجیت نے تلخی کے ساتھ کہا اور ایسا کرتے وقت اسے خود بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کن باغیانہ خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔ "ایک ایسا جمہوری نظام جس میں بے وقوفوں کو عقلمندوں کے برابر حقوق حاصل ہو گئے ہیں۔ اگر غور کرو تو آزادی سے زیادہ روٹی کی اہمیت ہے۔ ایک بھوک سے مرتی ہوئی قوم کو آزادی سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ کس چیز سے آزادی، انگریزوں سے؟ تو پھر تمہیں یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ اس سے پہلے ہندوستان مغلوں کا غلام تھا اور اس سے پہلے عربوں کا اور اسی طرح یہ سلسلہ آریوں اور دراویڈیوں تک جا پہنچتا ہے کیونکہ آخر وہ بھی تو باہر سے آئے تھے۔ تو بالآخر ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ آخر ہم بھی تو غیر ملکی ہیں کیونکہ کیا کوئی دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ اس کے اندر ایرانیوں، آریاؤں اور منگولوں کا خون نہیں دوڑ رہا ہے۔ دراصل کپور، دنیا کی تاریخ جھوٹ سے بھری پڑی ہے۔ ہوتا کچھ بھی نہیں سوائے اسکے کہ ہم آپس میں دوری کی ایک وجہ دریافت کر لیتے ہیں، نفرت کی ایک اور دیوار کھڑی کر لیتے ہیں اور اسے ڈھانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔"

کپور نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ شاید اس نے ضروری نہ سمجھا۔ سیاست سے اسے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ لیکن ایسا نہیں تھا کہ وہ سیاست سے قطعی طور پر ناواقف تھا۔ وہ جگجیت سے کہیں زیادہ دور اندیش اور سنجیدہ انسان تھا۔ جب کہ جگجیت اس کے بالکل برعکس ایک پرجوش نوجوان تھا۔ اس کے ساتھ واقعہ یہ تھا کہ جس تیزی سے کوئی بات اس کے ذہن میں آتی اس سے کہیں زیادہ تیزی سے وہ اسے کہہ ڈالتا اور یہی وجہ تھی کہ اسے قریب سے جاننے والے بھی بعض اوقات یہ سوچ کر پریشان ہو اٹھتے کہ وہ آخر ہے کس قسم کا انسان؟ فلسفہ اور ادب سے اسے گہری دلچسپی تھی۔ لیکن وہ فطری طور پر اس طرح بنایا گیا تھا کہ کسی چیز کا اثر جلد قبول کر لیتا۔ جب وہ مارکس کو پڑھتا تو بول چال اور عادات و اطوار سے کمیونسٹ نظر آنے کی کوشش کرتا۔ جب دانتے اس کے زیرِ مطالعہ ہوتا تو اس کے

اندر مذہب و حقانیت کا جذبہ موجیں مارنے لگتا۔ اسی طرح جب وہ نطشے کا مطالعہ کرتا تو سوپر مین بننے کا خواب دیکھنا شروع کر دیتا اور گرچہ ان دنوں وہ ایک انارکسٹ کا رول ادا کر رہا تھا مگر کوئی اسے یہ بات بتاتا تو اسے حیرت ہوتی۔

لیکن کپور کے لئے جگجیت کوئی مسئلہ نہ تھا۔ گرچہ ان دونوں کی دوستی زیادہ پرانی نہیں تھی لیکن اس معمولی سے عرصے میں ہی انھوں نے ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ وہ جگجیت کو آج کے اس گڈمڈ دور کی پیداوار سمجھتا تھا جو نئی پیڑھی کی نمائندگی کر رہا تھا۔ وہ "عالمگیر سچ" جو کہیں پر موجود ہے اور اس زوال پذیر کائنات کو ازسرِنو زندہ کر سکتا ہے، وہ اس کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہر "ازم" اور ہر فلسفے کا مطالعہ کرتا اور کسی پر بھروسہ نہ کر پاتا۔ لیکن پھر بھی جگجیت نئی پیڑھی کے ان نوجوانوں سے کتنا مختلف نظر آتا ہے جن کا اصول ہے "تقلید" اور "نقل"۔ جن کی اپنی کوئی شخصیت نہیں، اپنا کوئی فیشن نہیں، اپنا کوئی نظریہ نہیں۔

جانے وہ کتنی دیر تک ان خیالوں میں ڈوبا رہتا اگر ایک سرخ رنگ کی فیاٹ کار نے جو میدان کی وسعت میں بھنورے کی طرح سنائی دے رہی تھی، اس کی محویت نہ توڑ دی ہوتی۔ اس نے گردن موڑ کر سڑک کی طرف تاکا۔ سڑک کچھ اونچی تھی اور وہ لوگ اس کی ڈھال میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تاہم کار کی سرخ چھت نظر آ رہی تھی۔ کار جب نشیب سے گذری تو کپور نے اس کے اندر ڈرائیونگ وہیل سے چپکے ہوئے شخص کو پہچان لیا۔ یہ مسٹر راؤ تھے جو مزدوروں میں کام تقسیم کیا کرتے تھے۔ وہ اس وقت تک کار کی طرف تاکتا رہا جب تک وہ چڑھائی چڑھتی نظر آتی رہی اور جب وہ ایک سرخ نقطے میں بدل کر نظروں سے اوجھل ہو گئی تو ایک ٹھنڈی سانس لے کر اس نے جگجیت کی طرف دیکھا جو داہنا کان زمین سے لگا کر کچھ سننے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔"

"اس طرح مت لیٹو جگجیت،" وہ بولا۔ "کیڑے کان کے اندر گھس کر نقصان پہنچائیں گے۔"

"لیکن مجھے اس طرح لیٹنا پسند ہے۔" جگجیت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جب بھی میں اپنے کان زمین سے لگاتا ہوں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں زمین کے دل کی دھڑکن سن رہا ہوں۔ سنو! اندر، بہت اندر کہیں پر کوئی لاوا پھوٹ رہا ہے۔ کوئی چٹان اپنی جگہ سے ہٹ رہی ہے۔ وہ کتنی زور نکل گئی ہے اور اب اس کے چھوڑے ہوئے کھوکھلے حصے میں پانی بھر رہا ہے۔ کہیں پر قدرتی تیل کا

کوئی چشمہ بیدار ہو رہا ہے۔ کتنی تبدیلیاں، کتنے تغیرات، تخریب و تعمیر کا غیر مختتم سلسلہ اور ان تمام عمل اور ردِ عمل کو اپنے قبضے میں لئے ہوئے وہ عظیم قوت۔ قوتِ کشش! کپور، کبھی تم نے سوچا ہے کہ انسان زمین سے کتنا میل کھاتا ہے۔؟"

"زمین سے؟" تمہارا مطلب ہے انسان زمین سے مشابہت رکھتا ہے؟"

"بالکل، صورت شکل میں نہ سہی، اپنی عادات و اطوار میں، اپنی حرکات و سکنات میں تو رکھتا ہے اور پھر زمین کی طرح اس کے اندر بھی کتنے اسرار چھپے ہیں کسے پتہ۔ ہم اوپر سے جو کچھ نظر آتے ہیں وہ ہمارے اندرونی جذبات کی پس پرچھائیاں ہی تو ہیں۔ پھر زمین کی طرح انسان بھی تو ایک ناگزیر قوت کے زیر اثر عمل کرتا رہتا ہے۔"

"اور وہ قوت کیا ہے جگجیت؟ تقدیر؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" جگجیت نے خلافِ توقع ہنس کر جواب دیا۔ "لیکن وہ قوت تقدیر جیسی حقیر چیز نہیں ہو سکتی۔ انسان تقدیر سے بہت بلند ہے۔"

"جب تم اس قوت سے واقف ہی نہیں پھر کیونکر اس کا احساس ہے تمہیں؟"

"میں سمجھتا ہوں ہر چیز کسی نہ کسی قوت کے تابع ہے۔ چاند زمین کے اور زمین سورج کی۔ جسم کپڑوں کا اور روشنی حرارت کی۔"

"اور انسان خدا کا۔"

"اوں ہوں۔۔ پیڑ بیج کا غلام نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ بیج کی ہی ارتقائی شکل ہے۔ انسان اور کچھ نہیں، خدا کا پرتو ہے۔"

"آج کل تم کون سی کتاب کا مطالعہ کر رہے ہو جگجیت؟" کپور نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں پوچھا۔ "میرا خیال ہے ان دنوں تم ڈانٹے کی ڈیوائن کامیڈی پڑھ رہے ہو۔"

"آدمی جب تک اچھی کتابیں نہیں پڑھتا اچھی باتیں نہیں سیکھ سکتا۔" جگجیت نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "وہ لوگ جن کی صحبت میں ہم اچھی باتیں سیکھتے ہیں ان کے علوم بھی انہیں کتابوں کے رہین منت ہیں۔"

"مجھے حیرت ہے کہ تم اچھی باتوں کو سیکھنے کے لئے کتاب پڑھتے ہو۔" کپور بولا۔ "جب کہ میں

سمجھتا تھا کہ تم "صحیح" باتوں کے لیے ہی ان کی طرف رجوع کرتے ہو۔"

"مناسب ہے کہ ہم "صحیح" باتوں کی دریافت کریں۔ لیکن عمل ہمیں انھیں باتوں پر کرنا چاہیے جن سے ہمیں فائدہ اور مسرت حاصل ہوں۔"

"آہا، یہ جگجیت بول رہا ہے" کپور نے مسکراتے ہوئے کہا، "لیکن مجھے یاد پڑتا ہے گذشتہ ملاقات میں اس نے اس بات پر زور دیا تھا کہ آدمی کو نیک بننے کے بجائے عقلمند بننے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کیونکہ نیک انسان محض ایک درخت بھر ہے جو پھول اور چھاؤں بخشتا ہے۔ جب کہ عقلمند شخص وہ مالی ہے جو ایسے ایسے نہ جانے کتنے درختوں کو پروان چڑھاتا ہے۔"

"میرا نظریہ آج بھی نہیں بدلا ہے۔ یہ تمہاری سمجھ کا قصور ہے" جگجیت نے ناراضگی کے ساتھ کہا۔ "اور میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تم بھی کم و بیش وہی سوچتے ہو جو میں سوچتا ہوں صرف ان کے اظہار سے ڈرتے ہو۔"

"ہاں ۔۔۔ں ۔۔۔ لیکن میں نے سنا ہے کہ آدمی کو کسی نکتہ پر تین بار غور کیے بغیر کوئی نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے۔ اور غور کرنے کے لیے میرے پاس وقت کہاں ہے؟"

جگجیت نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ معاملہ اس قدر سنگین تھا کہ وہ مزید اس پر بحث کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے گھاس کی ایک پتی زمین سے توڑ لی اور اسے ملائمیت سے چباتے ہوئے سامنے جہاں تک نظریں کام کر رہی تھیں تاکنے لگا۔

سورج آسمان سے بہت نیچے اتر آیا تھا۔ اور سائے پہاڑ کے سینے سے نکل کر کھیتوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میدان جس میں ننگی چٹانیں لہروں کی طرح زمین سے ابھری ہوئی تھیں اور جنگل جس کا دوسرا سرا کالوں والے سنگلاخ علاقوں کی طرف ختم ہوتا تھا، ان کی نوجوان روحوں کو عجیب سا خوشگوار تاثر بخش کر رہے تھے۔

جگجیت نے محسوس کیا کہ گہری خاموشی میں ایک ننھی سی چڑیا کھیت کی منڈیر پر پھدک رہی تھی۔ پھدکتے پھدکتے وہ دونوں کے اتنے قریب آگئی کہ اس کی چہچہاہٹ انہیں سنائی دینے لگی۔ وہ دونوں اتنے ساکت اور خاموش، اپنے اپنے خیالوں میں اتنے گم بیٹھے تھے کہ وہ چڑیا انہیں کوئی بے جان سی چیز سمجھ کر ان کے بالکل قریب آگئی اور چوہے کی سی آواز نکالنے لگی۔ جگجیت

سب کچھ بھول کر اس چڑیا کا مطالعہ کرنے لگے۔ یہ ایسی چڑیا ہے جسے تم تقریباً ہر جگہ دیکھ سکتے ہو۔ مگر تم اس کا نام نہیں جانتے اور نہ جاننے کے لئے بے چین رہتے ہو۔ بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے جب تک یہ تمہارے سامنے رہی تمہیں اس کے وجود کا احساس رہا۔ یہ اڑ گئی اور تم اسے بھول گئے۔ ہاں خوبصورت تو ہے، مگر یہ چوہیا کی طرح آواز نکالنے کی عادی کیوں ہے؟

جگجیت چڑیا کو ایک ٹک تاک رہا تھا اور اسے احساس تھا کہ اس کی ذرا سی جنبش چڑیا کو اپنی جگہ سے اڑانے کے لئے کافی تھی۔ لیکن وہ یہ نہیں چاہتا تھا۔ مضبوطی سے وہ اپنے اعصاب سنبھالے رہا۔ مگر بالکل غیر ارادی طور پر، جیسا کہ ان لمحوں میں ہوتا ہے، اس کا داہنا بازو زمین پر جا گرا۔ خوفزدہ پرندہ ان کے سروں کے اوپر سے اڑتا چلا گیا۔

جگجیت نے سر ہلا کر کپور کی طرف دیکھا اور کہا۔

"اب چل پڑنا چاہیئے۔ میرے خیال میں اسٹیل پارک تک پہنچتے پہنچتے اندھیرا چھا جائے گا۔"

پارک سے اسٹیل سیٹی کی روشنیاں شروع ہوتی تھیں شہر نیا تھا اور اسکیم کے تحت بنایا گیا تھا اس لئے خوبصورت تھا۔ گرمی کے سبب فلیٹوں کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ گیلریز میں لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ سڑک پر جہاں دونوں سائیکل چلاتے ہوئے آگے اپنے رہائشی کوارٹروں کی طرف بڑھے جا رہے تھے ـــــ آفیسر کے درجے کے لوگ نظر آ رہے تھے۔ یہ لوگ ہمیشہ عورتوں کے ساتھ نظر آئیں گے یا کتوں کے ساتھ۔ کلب سے گذرتے وقت انھوں نے سازندوں کو غیر ملکی دھن بجاتے سنا۔ ایک بند ہوتی ہوئی کینٹین میں بیٹھ کر چائے پی اور ننگی عورت کی مورتی والے راستے پر ایک دوسرے کو الوداع کہہ دیا۔

گرمی کی رات اوّل تو جلد آتی نہیں، اور جب آتی ہے تو آپ کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے گھڑی کے کانٹے یکلخت چھلانگ لگا کر بہت آگے نکل گئے ہوں ـــــ

(۲)

جگجیت جب رات کا کھانا کھا کر، کتاب لے کر کھڑکی کے قریب بیٹھا تو بیتل کی الارم گھڑی سوا دس بجا رہی تھی۔ کتاب اس کے ہاتھ میں تھی، مگر اس نے پڑھنے کی غرض سے اسے نہیں اٹھایا تھا بلکہ یہ اس کی عادت تھی، حقیقت یہ تھی کہ وہ کھڑکی سے باہر تاک کر رات کی خاموشی سے لطف اندوز

ہونا چاہتا تھا۔

اس کا کوارٹر گھاس کے ایک وسیع و عریض میدان کے کنارے واقع تھا۔ چاندنی میدان میں چھٹکی ہوئی تھی مگر اس کی کھڑکی کے نیچے اس کے کوارٹر کا سایہ دبیز قالین کی طرح بچھا ہوا تھا۔ کوئی میدان میں ٹہل رہا تھا۔ آس پاس کے کوارٹروں کے لوگ سو چکے تھے۔ خود اس کا نوکر دوسرے کمرے میں خراٹے بھر رہا تھا، مگر اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ اسے احساس تھا کہ اسے ابھی بہت دیر تک نیند نہیں آئے گی اور اسے سونیا سے مل آنا چاہیے۔ مگر ہو سکتا ہے کہ سونیا سو چکی ہو۔ اس صورت میں وہ کپور کے کوارٹر کی طرف بڑھ جائے گا۔ کپور اسے دیکھ کر یقیناً خوش ہوگا کیونکہ ان دنوں اسے بے خوابی کی شکایت تھی۔ وہ گولی پینے کا عادی نہیں تھا اور اسے یقین تھا کہ کچھ دنوں کے بعد نیند اپنے وقت پر آنے لگے گی۔ شب خوابی کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں ہی وہ چل پڑا۔

میدان میں اب گرم ہوا چل رہی تھی۔ وہ بے موسم کے درخت جو ابھی اچھی طرح سے بڑھ بھی نہ پائے تھے، چاند کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ کنکریٹ کی سڑک جس پر تار کول بچھانے کا کام پچھلی خزاں میں گھونگھے کی رفتار سے شروع ہو چکا تھا، الیکٹرک لیمپ کے سبب روشنی تھی۔ اس نے اس سے گریز کیا۔ وہ بچوں کے کھیلنے کے میدان سے ہوتے ہوئے "پکی" سڑک پر پہنچا، جہاں سے عمارتوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ جس عمارت میں سونیا کا فلیٹ تھا وہ اس کے عقب کے باغیچے میں داخل ہو گیا اور سونیا کی خواب گاہ کی کھڑکی کے نیچے رک گیا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور اس کے ہرے پردوں پر اندر کی روشنی بکھری ہوئی تھی۔ تھوڑی بہت روشنی پردے کی اوٹ سے پھسل کر کھڑکی کے نیچے اُگے ہوئے گلاب کے پودوں پر بھی گر رہی تھی جن کے قریب جگجیت کھڑا تھا۔

اس نے کھانس کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ رات خاموش تھی اور شاید کھڑکی کے قریب کوئی نہ تھا۔ اسے دوسری بار زور سے کھانسنا پڑا۔ ایک لمحے تک وہ کھڑکی کی طرف تاکتا رہا۔ پھر دو گلابی ہاتھوں نے پردوں کو سرکا دیا اور کھڑکی میں ایک جواں سال خوبرو عورت کا چہرہ نظر آیا۔

"سونی!" جگجیت نے سرگوشی کی۔ وہ کھڑکی سے گرتی ہوئی روشنی میں آگیا۔ "میں درختوں کے جھنڈ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

سونیا نے شاید اسے پہچان لیا تھا۔ اس نے کھڑکی بند کر دی۔ یہ گویا اس بات کا اشارا

تھا کہ اسے درختوں کے جھنڈ میں چلا جانا چاہیئے۔

باغیچے سے کچھ ہٹ کر پرانے درختوں کا ایک جھنڈ واقع تھا جس میں کمپنی کی طرف سے کچھ بنچ بنوا دیے گئے تھے تاکہ لوگ وقت گذار سکیں۔ جگجیت ایک بنچ پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ عمارتوں کی روشنی جھنڈ سے چالیس قدم ادھر ہی ختم ہو جاتی تھی۔ صرف چاند کی روشنی، جہاں جہاں سے اسے موقع مل رہا تھا، جھنڈ کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد خشک پتوں پر کسی کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ سونیا اسے جھنڈ کے دہانے پر نظر آئی۔ چاند کی روشنی میں، سونے کے ناکافی لباس میں ملبوس، سونیا بھاگی آ رہی تھی۔ قریب آتے ہی وہ اس سے لپٹ گئی۔

"جگجیت!"، سرگوشیوں کے ساتھ، جیسا کہ جذبات کی آندھی میں لوگ کرتے ہیں، وہ اسے چومنے لگی۔ اسکا جسم معطر تھا اور جب جگجیت نے اس کے ہونٹوں کو چوما تو اسے احساس ہوا کہ جلد بازی میں سونیا نے لپ اسٹک کی کچھ زیادہ ہی تہیں ہونٹوں پر چڑھالی تھیں۔

"سونی، تم میرا انتظار کر رہی تھی؟" اس نے اس کے ملائم اور صحت مند کندھوں میں اپنی انگلیاں پیوست کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ نہیں جگجیت۔" سونیا نے ہنستے ہوئے کہا "لیکن مجھے امید تھی کہ تم ضرور آؤ گے۔"

وہ ہنستے ہوئے اٹھ گئی اور بنچ کے سامنے جہاں سوکھے پتوں کا اونچا سا ڈھیر نظر آ رہا تھا، اپنے آپ کو گرا لیا۔ وہ خود سپردگی کے جذبے سے معمور ہو رہی تھی۔

"اور تمہیں کیونکر یقین تھا کہ میں تمہارے پاس آؤنگا؟" جگجیت نے اس کے قریب جاتے ہوئے کہا ـــــ

"اس طرح جس طرح کہ مجھے یہ یقین نہیں تھا کہ تم نہیں آؤ گے۔" سونیا نے اپنے بازو اس کی طرف پھیلا دیے۔ پتے دونوں کے بوجھ سے دب رہے تھے، چور ہو رہے تھے۔ سونیا جتنی بے چین ہو رہی تھی، جگجیت اتنا بے چین نہیں تھا۔ جگجیت اس ارادے سے نہیں آیا تھا جس کی سونیا طلبگار تھی۔ لیکن سونیا کو روکنا یا اس کی محبت کا جواب نہ دینا اس کے لئے ناممکن تھا۔ دونوں کے درمیان جس قسم کا تعلق تھا اسے "محبت" کے بجائے "مصالحت" کا نام دیا جا سکتا تھا۔ سونیا کلکتہ کی لڑکی تھی۔ شروع شروع میں جگجیت نے اس سے محبت کی تھی۔ مگر سونیا نے بہت جلد اس کی غلط فہمی

دور کر دی تھی۔ اس نے صرف ایک ضرورت کے تحت جگجیت سے ملنا پسند کیا تھا۔ جگجیت اس ضرورت سے واقف تھا اور اس کے باوجود شروع شروع میں چونکہ اس نے اس سے محبت کی تھی (وہ احمقوں کی طرح اسے روحانی محبت ہی سمجھتا رہا تھا)، اس نے چاہا تھا کہ وہ سونیا سے الگ ہو جائے، لیکن پھر خود کو حالات کے سپرد کر دیا تھا۔ سونیا کسی لمحے بھی اس سے منہ پھیر کر کسی دوسرے سے تعلق قائم کر سکتی تھی۔ لیکن اس کے بعد جگجیت کو یقین نہ تھا کہ وہ سونیا کی جگہ کسی دوسرے سے رجوع کر سکے گا۔ جگجیت سونیا کے لئے ایک ضرورت سے زیادہ نہیں تھا۔ مگر سونیا جگجیت کے لئے محبت کی طرح ہی کچھ تھی، اگرچہ اب وہ اپنے آپ کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا تھا کہ سونیا کے لئے اس کی محبت ختم ہو چکی تھی۔

ہوا چل رہی تھی۔ لیکن اب اس میں قدرے خنکی آچلی تھی۔ ایک گلہری درخت سے اتر کر خشک پتوں میں دوڑنے لگی۔ اس وقت جب کہ دونوں لطف و اذیت کے سمندر میں تیر رہے تھے ایک کتّا جھنڈ کے کنارے آکر بھونکنے لگا۔

"ٹائگر! ٹائگر!" کسی نے ڈانٹ کر اسے خاموش کیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد وہ کتّا پھر سے بھونکنے لگا اور اب وہ عین جھنڈ کے اندر کھڑا بھونک رہا تھا۔ "ٹائگر حرامزادے، اپنی الاپ بند کر۔" اسی آواز نے دوبارہ کتے کو ڈانٹ پلائی۔ ایک ایسی چوہیا کی طرح جس نے بیوقوفی سے اپنی دم چوہے دانی میں الجھالی ہو، سونیا کانپنے لگی۔ جگجیت اسے اپنے سینے سے چپکائے سامنے کی طرف تاک رہا تھا۔ لیکن اس خطرناک لمحے میں بھی اسے اپنے سینے پر سونیا کے نپل کی چبھن کا احساس تھا۔

ایک شخص جھنڈ کے اندر چل رہا تھا۔ ایک جگہ چاند کی روشنی سے گذرتے وقت وہ کتّے کی زنجیر تھامے ہوئے نظر آیا۔ کتّا سامنے کی طرف منہ اٹھائے بھونک رہا تھا۔ "او بھگوان!" سونیا نے سرگوشی کی اور عین ممکن تھا کہ وہ چیخ پڑتی کہ جگجیت نے اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹوں کا قفل رکھ دیا۔ اسے یقین تھا کہ وہ شخص انہیں دیکھ نہ پائے گا۔ وہ انہیں پتوں کا ڈھیر ہی سمجھے گا اور اس میں اسے اندھیرا مدد دے گا، جس نے دونوں کو اس ڈھیر کا ایک حصّہ بنا دیا تھا۔ مگر کتّا ۔ ہاں، یہ بات خطرناک تھی۔ وہ شخص ان دونوں سے پندرہ ہاتھ کے فاصلے پر آکر کھڑا ہو گیا اور سامنے کی طرف تاکنے لگا مگر اسکی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں جیسے وہ درختوں کے درمیان چاند کو نہ پاکر حیران

ہو اٹھا ہو۔ کتا بیچ بیچ میں بھونک اٹھتا۔ شاید وہ بھی یہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ جس میں غیر معمولی چیز کا اسے گمان ہوا تھا وہ کس جگہ چھپی ہوئی تھی۔

"رام نگر، یہاں تو کچھ بھی نہیں" خود گو آدمی کی آواز آئی اور وہ کتے کو اس کی زنجیر سے کھینچتے ہوئے جھنڈ سے باہر چلا گیا۔

سونیا اطمینان کی ایک لمبی سانس لے کر جگجیت کی گردن سے لپٹ گئی۔ اس نے جگجیت کی بالوں بھری... چھاتی میں اپنی شہادت کی انگلی چبھوتے ہوئے ہنس کر کہا "وہ گیا جگجیت"

لیکن جگجیت خاموش تھا۔ وہ تفکر میں ڈوب گیا تھا۔ اسے خدشہ نہیں بلکہ یقین تھا کہ اس شخص نے دونوں کو دیکھ لیا تھا اور واپس چلا گیا تھا۔ لیکن سونیا اتنی سمجھدار نہیں تھی کہ اسے کوئی اہمیت دیتی کہ مالک اپنے "کتے" کے اشاروں کو بخوبی جان سکتا ہے۔

جب جگجیت سونیا کے بلاؤز کے بٹن لگا رہا تھا (ہر بار یہ کام اسے ہی انجام دینا پڑتا) تو سونیا ہنس کر بولی "جگجیت، پچھلی بار تم نے بٹن غلط سوراخوں میں لگا دیئے تھے جنہیں دیکھ کر میرے شوہر کو شبہ میں مبتلا ہو جانا چاہیئے تھا۔ مگر جانتے ہو، وہ جب میرے بستر پر آیا تو اس نے کہا۔ "سونیا، تمہارے بلاؤز میں ایک بٹن زیادہ ٹنگ گیا معلوم ہوتا ہے، ہاں، جگجیت، میں نے پچھلے جنم میں ضرور کوئی اچھا کام کیا ہوگا جو مجھے اتنا بیوقوف شوہر مل گیا۔ کیا نہیں؟"

ہاں، واقعی، سونیا ہر معاملے میں خوش نصیب تھی، اپنے شوہر کے معاملے میں بھی اور جگجیت کے معاملے میں بھی۔ سونیا کی عمر جگجیت کے برابر ہی تھی اور وہ بات چیت میں کافی بیباک تھی اس نے اسے بتایا تھا کہ اپنے شوہر کے لیے دو بچے جننے کے بعد اس نے مزید بچے پیدا کرنے سے انکار کر دیا تھا اور یہ کہ اگر جگجیت اسکا شوہر ہوتا اور اس کا شوہر جگجیت کی جگہ ہوتا تو وہ جگجیت پر اپنے شوہر کو ہی ترجیح دیتی۔ ایسے لمحوں میں جگجیت سوچنے لگتا سونیا ایک ایسی لڑکی تھی جس کی جسمانی پیاس کو صحت مند جسم کے بجائے بے وفائی سے تسکین ملتی تھی صرف FORNICATION سے۔

"تو میں چلی" سونیا نے اسے الوداعی بوسہ دیتے ہوئے کہا اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی جھنڈ سے باہر نکل گئی۔ اب جگجیت اکیلا تھا۔ درختوں کے اس جنگل میں اکیلا۔ یہ چاندنی، یہ اندھیرا اور کہیں کہیں سے نظر آنے والا آسمان اس کے اپنے جذبات سے کتنے ہم آہنگ تھے۔ جو وہ اپنے آپ کو،

سونیا کو اور اس خود گو آدمی کو بھول سکتا تھا مگر انہیں نہیں، ہر شکست کے بعد انہیں سے وہ تسکین حاصل کرتا آیا تھا۔ وہ جھنڈ سے نکلا اور شکست خوردہ قدموں کے ساتھ چلنے لگا۔ اس نے دور سے دیکھا، سونیا کی کھڑکی بجھ چکی تھی، اس کی پیاس کی طرح۔ کنکریٹ کی سڑک پر آکر وہ ٹھہر گیا۔

اسے کہاں جانا چاہیئے؟ گھر یا کپور کے پاس؟ چاند آسمان میں کافی بلندی پر چلا گیا تھا

کپور کا کوارٹر یہاں سے زیادہ دور نہ تھا۔ چاندنی اتنی تیز تھی کہ آنکھوں کو چبھ رہی تھی۔ ننگی مورتی والے سہ راہے سے وہ نیچے اترا اور گھاس کے میدان میں چلنے لگا۔ کچی سڑک جہاں سے بل کھا کر نیچے کی طرف جاتی تھی وہاں سے کپور کا کوارٹر گڈھے میں بسا ہوا نظر آتا تھا جو دوسرے کوارٹروں سے قدرے الگ تھلگ واقع تھا۔ گڈھا اترتے ہوئے اس نے سڑک کی جگہ میدان کو ترجیح دی جس میں درختوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ یہ سلسلہ کپور کے کوارٹر کے باغیچے تک جا کر ختم ہو گیا تھا۔ باغیچہ کوارٹر کے پیچھے واقع تھا جس میں کوارٹر کی دو کھڑکیاں کھلتی تھیں۔ کپور کی بیوی کو باغبانی کا شوق تھا اس لئے اس میں پھول بھی کھلا کرتے تھے اور سدا بہار پودوں کی گھنی کیاریاں تھیں۔ لکڑی کی چار دیواری پر، جو برسات کا پانی پی کر پھول گئی تھی، چاند کی بیباک کرنیں ملمع کاری کر رہی تھیں۔ پھاٹک پر ہاتھ رکھ کر جگجیت سوچتا رہا کہ وہ اندر جائے یا نہ جائے۔ خوش قسمتی سے کپور خاندان میں کسی کو کتا پالنے کا شوق نہ تھا ورنہ اب تک اس کے وجود کا خطرناک اعلان ہو چکا ہوتا۔ مگر ممکن ہے کپور سو چکا ہو۔ اتنی رات گئے مجھے دیکھ کر اس کی بیوی کیا سوچے گی۔ HOMOSEX وہ دل ہی دل میں ہنسا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ مڑتا اس نے دیکھا، برآمدے سے اتر کر کوئی اس کی طرف آرہا ہے۔ وہ آنے والے کی نگاہوں سے بچنے کی کوشش کرنے لگا مگر فوراً نو وارد نے اسے مخاطب کیا۔ یہ کپور تھا۔

"اوہ معاف کرنا کپور" اس نے مسکراتے ہوئے کہا، "میں بہت الٹے وقت آگیا ہوں۔"

"اندر آجاؤ، یا میں تمہارے ساتھ چلوں؟" کپور نے اس کے لئے پھاٹک کھولتے ہوئے کہا۔ لیکن بجائے اس کے کہ جگجیت کو اندر آنے دیتا وہ خود باہر چلا آیا۔ وہ سلیپنگ گاؤن میں ملبوس تھا اور سگریٹ پی رہا تھا۔ "سامنے میدان میں چلیں؟" وہ بولا۔

میدان کی ڈھلان پر جہاں کوارٹروں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا گڈس ٹرین کے گذرنے کی پٹریاں تھیں۔ پھر گوالوں کی کچھ ڈیریاں تھیں جن سے کوارٹروں میں دودھ سپلائی ہوتا تھا۔ میدان سے دور

شمال کی طرف ٹنل کی سرخ روشنی کو تاکتے ہوئے جس کے اندر سے ٹرینوں کو گزرنا پڑتی تھی، جگجیت کانپ گیا۔

"اوہ کپور، کتنا خطرناک ہے یہ؟" اس نے خوفزدہ آواز میں کہا۔ "مجھے ایک کہانی یاد آرہی ہے۔ جس میں ایسی ہی ایک سُرنگ کا ذکر تھا جس کے اندر سے ہر روز کسی نہ کسی آدمی کی لاش سگنل مین کو اٹھانی پڑتی اور پھر ایک دن وہ خود بھی اس سرنگ میں لقمۂ اجل ہوگیا۔"

"تم شاید ڈکنز کے "سگنل مین" کا ذکر رہے ہو۔" کپور ہنس کر بولا۔ "لیکن یہ ان دنوں کی بات ہے جب انسان زیادہ محفوظ نہیں تھا۔ آج تحفظ کے بہت سارے سامان بنائے گئے ہیں۔ اگر ڈکنز آج پیدا ہوتا تو وہ یہ افسانہ ہرگز نہ لکھ سکتا۔"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ آج کا انسان زیادہ محفوظ ہوگیا ہے؟" جگجیت بولا۔

"کسی حد تک تو ہو ہی گیا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "کم از کم پہلے جس قسم کے سائنسی خطروں سے انسان کو دوچار ہونا پڑتا تھا آج ان میں کمی آگئی ہے۔"

"لیکن دوسری قسم کے سائنسی خطرے پیدا نہیں ہو گئے ہیں کیا؟" جگجیت بولا — "کیا اس صدی کا انسان کسی بھی لمحے محفوظ ہے؟"

"یہ سب خطرے اخلاقی پستیوں اور ملک گیری کی ہوس کی پیداوار ہیں۔" کپور بولا۔

"یہ ملک گیری کی ہوس کی پیداوار تو ہو سکتے ہیں مگر اخلاقی پستی کا لفظ تم نے غلط استعمال کیا ہے۔" وہ بولا۔ "آج انسان اخلاقی طور پر اس لئے پست ہوگیا ہے کہ اس طرزِ معاشرت نے جس میں اسے زندہ رہنا پڑ رہا ہے، اسے ایسا بنا دیا ہے۔ تم ایک طرف خود غرض نہ سیاست وہ جو۔ اور بیکاری کا زہر اسے دے رہے ہو اور دوسری طرف اس سے توقع رکھتے ہو کہ وہ پیغمبروں کی طرح ہر برائی سے مبرا ہو جائے۔"

"ٹھیک ہے، تصور وار وہی لوگ ہیں جنھوں نے اس قسم کے طرزِ معاشرت کی نیو ڈالی ہے۔" کپور مسکراتے ہوئے بولا۔ "مگر انھیں کون فنا کا جام پلا سکے گا، تم یا میں؟"

"میں اپنے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" جگجیت نے تلخی کے ساتھ کہا۔ "مگر تم یہ کام نہیں کر سکتے۔ اخلاق کے علم بردار اس دنیا میں کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ جو بے رحمی کا جذبہ اپنے اندر رکھتے

ہیں اس دنیا کی تقدیر بنائیں گے۔ جیت اس کی ہو گی جو "صحیح" کے لئے لڑے گا، "نیکی" کے لئے نہیں۔"
"اس ایک بحث میں تم مجھے قائل نہیں کر سکتے۔" بالآخر کپور کو مسکرا کر بولنا پڑا۔ "اور نہ میں تمہیں ——"

"میں تمہیں قائل کرنا نہیں چاہتا۔ صرف سچائی سے روشناس کرانا چاہتا ہوں۔"

جگجیت کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ گفتگو کے دوران انہیں پتہ بھی نہ چلا کہ وہ لوگ پٹڑیوں پر چلے آئے تھے۔ نیچے کھیتوں کے کنارے ڈیری کی روشنیاں چاند کی تیز روشنی کے سبب دھندلی پڑ گئی تھیں جیسے کچھ براق تتلیاں اپنے پر پھیلائے کھڑی ہوں۔ ہوا میں کپور کا گاؤن اڑ رہا تھا۔ بار بار اس کا سگریٹ بجھ رہا تھا۔ وہ اسے لائٹر سے سلگاتا مگر پھر کش لگانا بھول جاتا۔ دونوں واپس لوٹ پڑے دونوں نے ایک کچا راستہ اپنایا جس کے دونوں کنارے درختوں کی دو رویہ قطار بہت دور تک چلی گئی تھی اس قطار میں شاخوں کے درمیان کہیں کہیں اسٹریٹ لیمپ جل رہے تھے۔ آس پاس کے کوارٹروں میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کتے تک نہیں بھونک رہے تھے۔ ان کے قدموں کی چاپ گونج رہی تھی۔ کتنی اداس تھی کائنات، موت کی طرح ویران، خواب کی طرح دھندلی۔ اور دونوں خاموش کیوں تھے ؟ کیا کسی ایک رائے پر دونوں کبھی متفق نہیں ہو سکتے ؟ آخر اس طرح ان کی دوستی کتنے دنوں تک نبھے گی ؟"

"میں سمجھتا ہوں کپور، آج کل میں واعظ بنتا جا رہا ہوں۔" جگجیت نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا، "سب سے اہم بات —— اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ میں کیا چاہتا ہوں، تو میں بتا بھی نہیں سکتا۔"

"میرے خیال میں تمہیں کچھ عرصہ کے لئے کلکتہ کا رخ کرنا چاہیئے۔" کپور نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا، "بہتر ہے کہ تم اپنے خیالوں کے بجائے کچھ دنوں تک انسان کی صحبت اختیار کرو۔"

"مجھے میری قبر سے باہر مت نکالو کپور۔" جگجیت نے ہنس کر کہا۔ "ورنہ وہ لوگ میرا کفن گھسیٹ لیں گے۔"

"تمہیں اپنی پسند کو دنیا کے قابل بنانی چاہئیے۔" کپور نے برتری کے جذبے کے ساتھ کہا۔ مگر فوراً اسے شدید ندامت کا احساس بھی ہوا۔

"آخر کیوں ؟" جگجیت نے احتجاج کیا۔ "آخر کیوں میں دنیا کو اپنی پسند کے مطابق نہ بناؤں۔"

میں شکست کا اقرار کیوں کروں ؟ میں جہاد کیوں نہ کروں ؟"

"تم کس سے لڑوگے ؟" کپور نے مضحکہ اڑانے والے لہجے میں کہا۔ "اور تم کس قسم کا انقلاب لانا چاہتے ہو ؟"

"میں ہر اس چیز سے لڑوں گا جو انصاف کے منافی ہو۔" جگجیت نے کچھ تامل کے بعد کہا۔ "اور جو انقلاب میں لاؤں گا وہ ہمارے اندر سے بزدلی مٹادیگی اور کوئی شخص کسی کا احسانمند نہ ہوگا۔ اور اس سلسلے میں میں دعا کے لئے نہیں بلکہ تلوار کے لئے ہاتھ اٹھاؤنگا۔"

"خوب۔ اور تم میدانِ عمل میں کب آؤگے ؟"

"میں صحیح وقت کا منتظر ہوں۔ جراحی کے لئے یہ لازمی ہوتا ہے کہ زخم پہلے اچھی طرح سے پک جائے ——"

"اور اس زخم کو پکاتے میں تم سونیا کار کھیں بن کر جو فرض انجام دے رہے ہو وہ قابل قدر ہے۔" کپور نے تلخی کے ساتھ کہا۔ اس کا چہرا حیرت انگیز طور پر تبدیل ہوگیا تھا۔ اور وہ جوش میں آکر کہتا چلا گیا۔ "مجھے کہنے دو۔ جگجیت۔ آج تک جانے میں تمہیں کیوں اتنی اہمیت دیتا رہا۔ کھلے لفظوں میں اپنے آپ سے برتر خیال کرتا رہا۔ تم نے اپنے تلخ اور باغیانہ جملوں کے ذریعے خود میری وقعت میری نظروں سے گرادی تھی۔ خدا، انسانیت اور اخلاق تمہاری نظروں میں کچھ حقیقت نہیں رکھتے مگر معاف کرنا میں ان کی قدر کرتا ہوں۔ اور تم جو انھیں حقیر اور غلط تصور کرتے ہو تو وہ اس لئے نہیں کہ تم ان سے اچھی طرح واقف ہو بلکہ اس لئے کہ دوسرے ان میں یقین رکھتے اور انھیں اہمیت دیتے ہیں اور چونکہ تم اپنے آپ کو دنیا کے پرے پرے سب سے برتر اور اعلیٰ خیال کرتے ہو اس لئے دوسروں کی سطح میں رہ کر انکے بارے میں کیسے سوچ سکتے ہو ؟ تم اور کچھ نہیں، برتری کے جذبے کے مارے ہوئے انسان ہو۔ بہکے خیالات کا فلسفی، گھر گھر جاکر بے سرے باجے بجینے والا انسان بے شک کچھ لوگ جو تمہاری ہی طرح سوچتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگوں کی تعداد کتنی ہے ؟ اور اس بات کی کیا دلیل ہے کہ کچھ عرصہ بعد وہ لوگ کسی پاگل خانے کی راہ نہیں لیں گے۔ بے شک انقلاب خون مانگتا ہے۔ مگر تم تو خون بہانے کے لئے انقلاب لانا چاہتے ہو۔ تم جمہوریت کو اس لئے بیکار اور تضیع اوقات سمجھتے ہو کیونکہ یہ تمہیں عام لوگوں کی سطح میں لے آتی ہے۔ میرے عظیم ریفارمر

کبھی تم نے سوچا ہے کہ خود تمہیں بھی کتنی اصلاح کی ضرورت ہے۔؟"

"آہ، کپور، تم نہیں جانتے تم کیا کہہ رہے ہو؟" جگجیت نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ دونوں ٹھہر گئے تھے۔ مگر کپور نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا، "خدا حافظ۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس یقین کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ وہ ٹھوس سچائیاں ہیں۔ میں یہ ہرگز نہیں دیکھ سکتا کہ جن قدروں کا میں احترام کرتا ہوں، تم انھیں حقارت سے دیکھو ——" اور وہ سڑک سے اتر گیا اور اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ اس نے ایک بار بھی مڑ کر پیچھے کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ چاندنی کی مدد سے جھاڑیوں اور پتھروں سے بچتا ہوا وہ چلا جا رہا تھا۔ جگجیت کی سسکی اسے سنائی دے رہی تھی، مگر اس کے قدم نہیں رکے۔ ہوا ٹھنڈی تھی۔ درختوں کے سائے اس کی راہ میں پھیلے ہوئے تھے۔ چاروں طرف پژمردگی اور بے دلی چھائی ہوئی تھی۔ دور کہیں پر بہت سارے کتے گویا کل کائنات پر حقارت سے بھونک رہے تھے۔ تاروں جڑا آسمان، خاموش موسیقی سے لبریز پرسکون رات اور اس کی غیر مطمئن روح۔ اس سے زیادہ اداس نغمہ کسی نے کیا تخلیق کیا ہوگا۔ سامنے کے جنگل میں ایک کوئل چلا رہی تھی اور جب وہ اپنے باغ کے پھاٹک پر پہنچا تو یکایک وہ خاموش ہو گئی۔

اس کے اپنے کمرے کی کھڑکی سے روشنی باغیچے کی جھاڑیوں میں گر رہی تھی بوجھل قدموں کو گھسیٹتا ہوا وہ اپنے کمرے میں پہنچا اور آرام کرسی پر گر سا پڑا۔ اس کی آنکھیں بھیانک طور پر سرخ ہو رہی تھیں۔ درد سے اسکا سر پھٹا جا رہا تھا اور اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی ابھی اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑیں گے۔ کہیں اس نے جگجیت کے ساتھ بے انصافی تو نہیں کی تھی۔ ہر انسان اپنے طور پر سوچنے کا عادی ہوتا ہے، تو پھر جگجیت کو اس نے مجرم کیوں سمجھ لیا؟ جگجیت خود پرست سہی، مگر کیا وہ خود پرست نہیں تھا؟ آخر دوسروں کے حق میں فیصلہ دینے کا اختیار ہیں کس نے دیا ——؟

"میرے خدا!" اس نے بے چینی سے اپنا سینہ دباتے ہوئے کہا، "مجھے نیند کیوں نہیں آتی؟ میں سونا چاہتا ہوں۔ اف، مجھے نیند نہیں آئی تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

یکایک اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ آرام کرسی سے اٹھا اور اپنی بیوی کے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے روشنی جلائی اور اپنی بیوی کی طرف دیکھے بغیر جو پلنگ پر نیند کی گولیوں کے

زیر اثر نیم برہنہ گہری نیند سو رہی تھی، اس نے الماری کھولی اور اندر سے نیند لانے والی گولیوں کی شیشی بر آمد کی۔ روشنی بجھا کر وہ اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ پانی گلاس میں موجود تھا۔ گلاس کی طرف تاکتے ہوئے اسے یہ سوچ کر پریشانی ہوئی کہ اسے کتنی گولیاں لینی چاہئے۔ وہ ان کا عادی نہ تھا اور نہ ہی وہ اپنی بیوی کو اس کی قیمتی نیند سے جگا کر اس کے ساتھ اتنی بڑی بے انصافی کر سکتا تھا۔ ایک گولی نکال کر وہ پانی کے ساتھ نگل گیا، پھر دوسری گولی اور پھر تیسری گولی۔ یہاں تک کہ اس کے پپوٹے پتھر کی طرح بوجھل ہونے لگے اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کی پلکیں آہنی سلاخوں میں بدل گئی ہوں۔ شیشی اس کے ہاتھ سے پھسل کر میز پر جا گری اور ایک میٹھی سی، گدگدانے والی غنودگی اس کے حواس پر طاری ہونے لگی۔ وہ نشہ کا عادی نہ تھا، مگر اس وقت جب کہ دھیرے دھیرے اس کے اعصاب خوابیدہ ہو رہے تھے اسے محسوس ہو رہا تھا، واقعی بین الاقوامی پیمانے پر لوگ نشے کے اتنے غلام کیوں ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ پلنگ پر گر سا پڑا۔ تمام تکلیفیں، جان کنی کی وہ کیفیت جو تھوڑی دیر قبل اس پر بری طرح قابض تھی دور، بہت دور، دور، دور کہیں دھندلکے میں ڈوبتی جا رہی تھیں جیسے مسیح اپنی صلیب کے ساتھ شفق کی سرخی میں گم ہو رہا ہو۔

تبھی کسی نے اس کے سامنے کی کھڑکی پر دستک دی۔ کوئی سرگوشی میں اسکا نام لے کر پکار رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کھول دینی چاہی، مگر جیسے اس کے اعضا بے حس ہو گئے تھے ـــــ"

"کپور!" پھر کسی نے سرگوشی کی اور کھڑکی کے مربع نما شیشے جھنجھلا اٹھے۔ اس نے کھینچ تان کر اپنے جسم کو اوپر اپنی کہنیوں پر اٹھایا اور اندھے کی طرح ٹٹولتے ہوئے چٹخنی گرا دی

کواڑ خود بخود کھل گئے۔

باہر جگجیت کھڑا تھا۔

"آہ کپور، میں کہنا چاہتا ہوں . . ." جگجیت نے اسکی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا، "کیا وہ سب مذاق نہیں تھا . . ؟"

وہ جگجیت کی تسکین کے لئے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر نیند آندھی کی طرح اس کے رگ و پے میں سرعت کرتی جا رہی تھی۔

"کپور تم ہاں کہہ دو۔ تم نہیں جانتے تم نے مجھے کس عذاب میں ڈال دیا ہے۔ اگر تم نے میرا اعتماد مجھے نہ لوٹایا تو شاید اس رات کی کبھی صبح نہ ہو۔"

جگجیت اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ مگر کپور گہری نیند سو چکا تھا۔ "کپور، کپور۔" اس نے آواز دی۔ مگر کپور نہیں جاگا۔ وہ خاموش ہو گیا اور آنسو اس کے گالوں پر بہہ نکلے۔ دیر تک وہ اپنی جگہ کھڑا خاموشی سے روتا رہا۔" پھر شکست خوردہ قدموں کے ساتھ چلتا ہوا باغیچے سے باہر نکل گیا۔

●●●●

صدیق عالم
زیر اہتمام زم زم بک ٹرسٹ
وشو کرما نگر، شاہدرہ، دلی ۱۱۰۰۳۲
قیمت
۱۵ روپے